ڈاکٹر نعیم مظہر

تقسیم سے پہلے اردو ناولوں میں اسلامی فکر کی عکاسی

Literature reflects different philosophies and thought directly related to life. Religious thought also has its significance in this regard. Right from its start, Urdu novel has reflected Islamic thought through it characters, their activities, dialogues and their life style. This article presents a critical study of Urdu novel from this angle.

ادب میں انسان سے متعلق جہاں اور دیگر فلسفوں کا تعلق رہا ہے وہاں مذہب بھی ادب کا ایک بہت بڑا حوالہ ہے۔ یہ ایک ایسا حوالہ ہے جو کسی نہ کسی صورت میں فن کار پر اثر انداز رہا ہے اور کہیں نہ کہیں اس کے فن میں ظاہر ہوتا ہے، کیونکہ انسان کے بنیادی عقائد کی تشکیل میں مذہب بھر پور کردار ادا کرتا ہے۔ زندگی کے بارے میں اس کی سوچ اور اس کے انداز فکر کو مذہب اپنے اصولوں کے مطابق پختہ کرتا ہے اور یہ عمل عموماً زندگی کے ایسے دور میں ہی شروع ہو جاتا ہے جب انسان کو پوری طرح سے شعور بھی حاصل نہیں ہوتا یعنی بچپن ہی میں انسان کے مذہبی عقائد پختہ ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ وہ ان عقائد کو اپنی زندگی کا ایک بنیادی جزو بنا لیتا ہے۔ اس بات کا دارومدار بھی انسان کے ماحول پر ہوتا ہے۔ اگر اس کا ماحول مذہب میں زیادہ حساس ہوگا اور اس کے برعکس اگر اس کا دور یا زمانہ یا ماحول مذہب سے بیزار ہے تو پھر مذہب کا اس کی زندگی میں بھی عمل دخل کم ہوگا۔ ہمارے سامنے اس بات کی مثال موجودہ دور میں یورپ کی ہے جہاں کا ہر فرد مذہب سے دور ہوتا جا رہا ہے کیونکہ وہاں کا ماحول اور معاشرہ مذہب سے بیزار ہو چلا ہے۔ اسی لیے وہاں کے ادب میں مذہب کی بازگشت ہمیں کم ہی سنائی دیتی ہے۔ خود ہمارے ادب میں آج مذہبی عقائد اور ان کی تبلیغ شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ اس بات سے ہرگز مراد نہیں لینی چاہیے کہ ادب کو مذہبی عقائد کی تبلیغ سمجھتے ہیں، ادب تو ادب ہوتا ہے جس میں ایک فن کار ہر قسم کے عقائد اور فلسفے کو سمو سکتا ہے۔ اس بات کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس تناسب کا جائزہ لے سکیں جس تناسب سے گزشتہ ادوار میں مذہب کو ادب میں جگہ ملتی رہی اور جس تناسب سے آج کے دور اور زمانے میں فن کار اپنے فن میں مذہب کی نمائندگی کر رہا ہے۔ ناول اور اس کی تنقید پر بات کرتے ہوئے اس نکتے کو بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔

اردو ناول میں جو مذہبی رجحان ملتا ہے اسے خالص مذہبی رجحان تو نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ مختلف ناول نگاروں کے ہاں مذہب اور اعتقادات کا اثر بخوبی ملتا ہے۔ اردو ناول کی ابتدا نذیر احمد کے ہاتھوں ہوئی، ان کے ہاں مختلف مقامات پر اسلامی عقائد اور اصولوں کا پرچار ملتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر میں اسلامی اقدار و اقتدار کا سورج غروب ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ ابھی لوگوں کے دلوں میں وہ زخم تازہ تھے جو انہیں بیرونی قوتوں کے حملوں اور اقتدار پر قبضے کی شکل میں ملے تھے۔ سو بہت سے لوگ ایسے تھے جنہوں نے مذہبی اقدار کو گلے لگایا اور انہیں بچانے کی حتی المقدور کوشش کی۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے

جنہوں نے حقائق کو تسلیم کیا اور ایک نئے طور پر اپنے مذہبی عقائد کو اجاگر کیا۔ یہ گروہ سر سید احمد خان کا تھا۔ مولانا نذیر احمد بھی انہی کے ہمنوا تھے۔ مذہب سے وابستگی انہیں بھی تھی۔ چنانچہ انہوں نے جدید اقدار کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے ناولوں میں عوام کی توجہ اسلامی اصولوں کی طرف دلانے اور لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر سہیل بخاری ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> نذیر احمد مولوی اور حافظ ہونے کے ساتھ ساتھ مفسر قرآن بھی تھے اس لیے ان کے تمام ناولوں میں مذہب اور تعلیم اخلاق پر زور ہے۔ خانہ داری کے متعلق ان کی وسیع معلومات اور جزئیات وتفصیلات کا بیان مشاہدے کی باریکی اور گہرائی کے ساتھ ساتھ ان کی ابتدائی اندوہناک زندگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔(۱)

ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں:

> اپنے زمانے کے بیشتر ادیبوں کی طرح مولانا بھی مذہب اخلاق پہلے ہیں اور فن کار بعد میں وہ زمانہ ہی ایسا تھا جب کہ انگریزی نشاۃ الثانیہ کی روشنی نے صاحب عقل وفہم مسلمانوں کو اپنی قوم کی زبوں حالی کی طرف متوجہ کیا اور ان لوگوں نے اس قوم کو قعر مذامت سے نکالنے کے لیے کوشش شروع کی۔ مسلمانوں کی بگڑی ہوئی معاشرت صحیح راہ پر لگانے کے لیے مولانا بھی اپنی سی کوشش میں مصروف رہے۔(۲)

احسن فاروقی نے مولانا کے ہاں اس مذہبی رجحان کا قدرے صحیح اندازہ لگایا ہے۔ مولانا جہاں ایک طرف اپنی مذہبی اقدار کو عزیز رکھتے ہیں وہاں دوسری طرف انہیں نئی تہذیب اور اس کی برق رفتار ترقی بھی نظر آ رہی تھی۔ ایسے میں وہ دونوں کو ساتھ لے کر چلنے کے خواہاں تھے مگر ایک آفاقی اصول جس کے تحت کسی نئی چیز کے لیے کسی پرانی چیز کی قربانی کے وہ قائل نہ تھے جب بھی انسان اپنی زندگی کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ اپنے مذہبی اور معاشرتی قوانین کو سامنے رکھتا ہے مگر جہاں تبدیلی باہر سے آتی ہے تو ایسی صورت میں انسان کو کچھ نہ کچھ کھونا ضرور پڑتا ہے۔ اردو ناول کا آغاز غدر کے بعد ہوا اور غدر کے بعد مسلمانوں کی حالت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ انگریزی تہذیب وتمدن نے پرانی اقدار کو تیزی سے ختم کرنا شروع کر دیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا بھی درست ہے کہ اسلامی اصول اور قوانین جدیدیت اور اس کے تقاضوں کے خلاف ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ مغلیہ دور حکومت کے زوال کے زمانے میں اسلام حقیقی معنوں میں کہیں نافذ ہی نہیں تھا۔ حکمران طبقہ اپنی عیاشیوں اور بے کار مشاغل میں مصروف تھا۔ جب کہ عوام بھی انہی کی پیروی کر رہی تھی ایسے میں کسی بھی بیرونی قوت کے لیے یہ بہت آسان بات تھی کہ وہ حکومت پر قبضہ کرے اور انگریز تو باقاعدہ منظم ہو کر آئے سو انہیں یہاں پر حکومت کرنے میں کوئی مشکل نظر نہ آئی۔ لہذا نذیر احمد اور ان جیسے اور بہت سے لوگ اس کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ اب کیوں کر اسلامی طرز زندگی کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ احسن فاروقی لکھتے ہیں:

> مولانا کی سب سے اہم دلچسپی مذہب سے تھی مگر انگریزی نشاۃ الثانیہ اپنے ساتھ ایک اور قدر بھی ساتھ لائی تھی یعنی سیاست۔ اس وقت ہر فرد کے سامنے دو متضاد راہیں تھیں اس وقت ایک اسلام کی راہ اور دوسری برٹش حکومت کی راہ اور ان دونوں راہوں کے درمیان ایک راہ تلاش کر لینا ضروری ہو گیا تھا۔ مولانا کو اس امر پر بھی غور کرنا پڑا کہ ایک فرد مسلمان کے حکومت کے ساتھ کیسے تعلقات ہونے چاہیں۔ یعنی اس کی سیاسی حیثیت کیا ہو۔(۳)

اسلامی افکار اور اقدار کی عکاسی

مولوی نذیر احمد کا تیسرا ناول "ابن الوقت" ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۸۸۲ء ہے۔ اس میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے

بعد انگریزوں کی ہندوستان میں بڑھتی ہوئی عملداری اور ان سے وقتی طور پر فائدہ حاصل کرنے والوں کی کہانی ہے۔ یہ ایک ایسے تعلیم یافتہ شخص کی کہانی ہے جو انگریز دوستی کا خواہاں ہے اور اس قرب کے لیے وہ اپنی مذہبی اور معاشرتی روایات کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اس ایک فرد کے ذہنی تغیرات کو پیش نہیں کیا بلکہ انھوں نے اس دور کے بیشتر ذہنوں میں اُٹھنے والے خیالات کی تصویر کشی کی ہے۔ نذیر احمد نے اس ناول میں مغربی اور مشرقی تہذیب کا موازنہ کر کے دونوں تہذیبوں کی اچھائیوں اور برائیوں کی نقاب کشائی بھی کی ہے۔

''ابن الوقت'' کے وہ اقتباسات درج ذیل ہیں جن میں ناول نگار نے اسلامی افکار کو اجاگر کیا ہے:

ابن الوقت کے ساتھی بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ ابھی نماز مغرب میں کوئی آدھے گھنٹے کی دیر تھی ادھر آفتاب کا جنازہ کفن خون آلود شفق پہنا کر تیار کر چکے تھے کہ قبر مغرب میں اُتار دیں اور پھر بے کفن کی لاشیں دیواروں کے سائے کا ماتمی کفن پہن چکی تھیں...... حضرت افطار کا وقت قریب ہے اور قلعہ دور۔(۴)

ایک جگہ پر عیسائی اور مسلم میں فرق کرنے والی کتاب یعنی قرآن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ عیسائیوں کے ساتھ کھانا کھانے کی اجازت صرف اس لیے ہے کہ وہ بھی اہل کتاب ہیں۔ اس فکر کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

آج میں نے آپ کے ساتھ کھانا کھانے کو کھا لیا۔ میں نے اپنے اذعان میں ہرگز خلاف مذہب اسلام نہیں کیا کیونکہ آپ لوگ اہل کتاب ہیں اور ہمارے قرآن میں اہل کتاب کے ساتھ کھانے کی صریح اجازت موجود ہے۔(۵)

ہر مسلمان آدمی ایک دلیر سپاہی کی مانند ہے۔ وہ ہندوؤں کی طرح ڈرپوک نہیں ہے بلکہ ہر معصیت کو بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے۔ نذیر احمد نے اسلام کو سپاہیانہ مذہب قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں ان کے مذہب کو (آپ معاف کیجئے گا) سپاہیانہ مذہب خیال کرتا ہوں۔ میرے نزدیک ہر مسلمان مذہباً سپاہی ہے...... ہندو فقیر جب بھیک مانگے گا، گڑگڑا اور مری ہوئی آواز سے بھگوان بھلا کرے، برخلاف مسلمان فقیر ہے کہ فقیری میں بھی طنطنے کو نہیں جانے دیتا۔(۶)

مسجد میں نمازی انگریز کے ساتھ کھانا کھانے والوں کو بھی ہندو سمجھتے ہیں۔ اس پر بحث ہوتی ہے اور نمازی امام صاحب کا انتظار کرتے ہیں کہ وہ سلام پھیریں اور ان کے سامنے یہ مسئلہ بیان کریں۔ دوسرا نمازی یوں گفتگو کرتا ہے:

تو وہ جانے اور اس کا ایمان جانے مگر انگریز کے ساتھ کھا کر اس کو ہم لوگوں کے ساتھ کھانا پینا نہیں رکھنا چاہیے تھا میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید روزے اور نماز سب کی قضا لازم آئے گی۔(۷)

ابن الوقت انگریز کے ساتھ کھانا کھانے کی دلیل قرآن کے حوالے سے دیتا ہے یعنی سورۃ مائدہ کے پہلے رکوع میں دیکھ لیں:

وطعام والذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم کے کیا معنی ہیں؟ پھر ایک انگریز کے ساتھ کھانا کھا لینے کے علاوہ آپ بے دینی...... عین رمضان کا مہینہ تھا کہ نوبل صاحب ہمارے یہاں آتے ہیں، دن بھر روزہ رکھتا تھا۔ خدا کے فضل سے ایک روزہ قضا نہیں کیا...... صبح کی تلاوت جو میرا معمول تھا، میں نے اس میں ناغہ نہیں ہونے دیا۔(۸)

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرق پیدا کرنے والے رسم ورواج اور اسلامی روایات کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندو دھوتیاں اور کھڑاویں چھوڑ کر پاجامے اور جوتیاں پہنے، اپنی عورتوں کو پردے میں بٹھانے اور مسلمانوں کے علوم پڑھنے لگے۔ ہزارہا ہندو محرم میں جو مسلمانوں کا مشہور مذہبی تہوار ہے تعزیہ داری کرتے ہیں، مسلمان بزرگوں کی قبروں کی تعظیم کرتے ہیں ان سے منتیں مانگتے ہیں۔(۹)

ناول میں ایک جگہ پر بڑے مدلل انداز میں کئی افکار یعنی نبی کریمؐ کی زندگی مبارک ایک مکمل انسان کی زندگی ہے قریش مکہ کی وہ تکالیف جو حضورؐ اور ان کے صحابہ کرامؓ کو دی گئیں، ہجرت کا واقعہ، جنگ بدر میں مسلمانوں کی فتح، بُت پرستی کا خاتمہ اور توحید، شہر مکہ کا امن و امان کا گہوارا بننا، کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> میں بہت وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ مذہب اسلام میں کوئی بات ایسی نہیں جس کی وجہ سے گورنمنٹ مسلمانوں کی طرف سے نامطمئن ہو۔ ہمارے پیغمبرؐ کی زندگی میں دونوں طرح کے نمونے موجود ہیں۔ ان کی پیغمبری کی عمر میں سے آدھی سے زیادہ مظلومی کی حالت میں گزری...... ان کو اپنے طور پر خدا کی عبادت نہ کرنے دیتے، ان کے ساتھ لین دین تک موقوف کر دیا جاتا تھا اور موقع پاتے تو ان پر دست درازیاں کرتے۔ اس حالت میں جو مسلسل گیارہ برس تک رہی پیغمبرؐ کی اپنے معتقدین کو برابر یہی تاکید تھی کہ خدا کی راہ میں دنیوی تکلیفات کو بہ اُمید فلاح عاقبت صبر کے ساتھ برداشت کرو اور مذہب اسلام تھا کہ ان مزاحمتوں اور مصیبتوں میں اپنی صداقت کی وجہ سے چپکے چپکے کرتا رہا تھا...... اور ایک فتح مند پیغمبرؐ کا مکے میں داخل ہوا تھا جہاں کے لوگوں نے ان کے ساتھ ایذا دہی اور بے حُرمتی کا کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا تھا کہ آپؐ کعبے میں تشریف رکھتے تھے اور شہر مکہ میں امن عام کی منادی ہو رہی تھی۔(۱۰)

ایک جگہ پر ابن الوقت بتاتا ہے کہ دائرہ اسلام بہت وسیع ہے اور اتنا آسان مذہب ہے کہ اس کے مقابلے میں دنیا کا کوئی بھی مذہب نہیں لیکن آج کل کے مولویوں نے لوگوں کو مختلف فرقوں میں ڈال دیا ہے اور مولوی بڑی جلدی یہ فتویٰ صادر کر دیتے ہیں کہ یہ آدمی خارج از اسلام ہے۔ اس کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

> مسلمانوں کو خدا نے کتنا عمدہ مذہب دیا تھا کہ اس کی بدولت عرب کے وحشی اونٹوں کے چرانے والے اس قدر تھوڑے عرصے میں جس کی نظیر ساری دنیا کی تاریخ میں مفقود ہے گویا تمام روئے زمین کے بادشاہ ہو گئے پھر وہ مذہب سہل و سلیس ہونے کے علاوہ بنظر غائر سے دیکھو تو اختیاری نہیں بلکہ فطری یعنی یہ عبادت دیگر اضطراری لازمہ انسانیت کہ کسی حال میں انسان سے منفک ہو ہی نہیں سکتا۔ پیغمبر اسلام کا خاتم النبیین اور مُرسل الی کافۃ الناس ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ دائرہ اسلام بہت وسیع ہے...... ایک مسلمان ہمارے زمانے کے مولوی ہیں کہ بات بات پر لوگوں کو کافر یعنی اسلام سے خارج ٹھہرا دیتے ہیں۔ ابن الوقت تو ان کے نزدیک بڑا کافر بھی نہیں بلکہ مجموعہ کفار تھا۔ حنفی، شافعی، سنی، شیعہ، وہابی، بدعتی، مسلمانوں کے جتنے فرقے ہندوستان میں ہیں، سب کے علماء نے قرآن کی آیتوں سے، حدیثوں سے، سند پکڑ پکڑ کر بالاجماع ابن الوقت کے کفر کے فتوے لکھے۔(۱۱)

ابن الوقت دنیا و دین دونوں کی اصلاح کا مدعی تھا اور اس کے مذہبی خیالات کے بارے میں مولوی نذیر احمد یوں رقمطراز ہیں:

> پانچوں وقت جامع مسجد کی اول جماعت کی تکبیر تحریمہ ناغہ نہیں ہونے پاتی تھی اور تہجد اور اشراق کے علاوہ تحیۃ المسجد، صلوٰۃ التسبیح، منزل فیل، دلائل الخیرات، حزب والبحر اور خدا جانے کتنے اور وظائف جمعے کے دن کبھی اس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو پہر دن چڑھے سے نماز جمعہ کی تیاری ہو رہی ہے۔(۱۲)

ناول میں مولوی نذیر احمد اس اسلامی حکم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انسان مرنے کے بعد سب کچھ یہاں ہی چھوڑ جائے گا۔ ساتھ اس کے صرف اس کے کیے ہوئے اعمال ہی جائیں گے اور وہی اسے کامیاب کریں گے کیونکہ مسلمان کے لیے یہ دنیا جہنم ہے اور کافر کے لیے جنت ہے اسی کی طرف اشارہ یوں کرتے ہیں:

> اسی طرح انسان ساری عمر بکمال اطمینان دنیا کی درستی میں لگا رہتا ہے اور اس کو دنیا کے ساتھ دلی وابستگی ہو

جاتی ہے کہ دفعتاً اس کو دنیا چھوڑنی پڑتی ہے اور چونکہ وہ دنیا سے مانوس تھا اس کو دنیا کی ابدی مفارقت کا بہت صدمہ ہوتا ہے۔وہ سازو سامان دنیا میں سے کوئی چیز ساتھ نہیں لے جا سکتا ہے اور جو ساتھ لے جا سکتا ہے یعنی اعمال، وہ عاقبت میں شاید اس سے زیادہ کارآمد نہ ہوں جیسے ایک گھر کے فرنیچر دوسرے گھر میں ..... خدا اپنے فضل سے ہم کو توفیق دے کہ گرویدہ دنیائے چند روزہ نہ ہوں اور عاقبت کے لیے جہاں ہم کو سدا رہنا ہے سامان کرتے رہیں آمین۔(۱۳)

ایک جگہ پر ابن الوقت کے حوالے سے قرآنی آیات بھی ملتی ہیں جن میں مختلف دعاؤں کے مجموعے ہیں۔ جب انسان پر مشکل آتی ہے تو وہ ان دعاؤں کے ذریعے اپنے آپ کو محفوظ بناتا ہے اور خدا کی ذات کے سامنے ہاتھ پھیلا کر یہ دعائیں مانگتا ہے یعنی

سب نے نذل کر منتوں اور نیازوں اور چلوں اور عملوں اور دعاؤں کی بھرمار کر دی اور ختم خواجگان **لاالہ الا انت سبحانک انی کنتی من الظالمین** اور **امن اجیب المضطر اذا دعاہ و یکشف السوء** اور **ظم تقتلو ھم ولکن اللہ قتلھم و مارمیت اذرمیت ولکن اللہ رمیٰ** اور **اللھم انا نجعلنا لک فی نحورھم و نعوذبک من شرورھم حرب البحر** اور دلائل الخیرات اور یٰسین شریف اور صلوٰۃ الحاجہ اور اعمال حصر اللسان کے حرب صاحب کلکٹر پر چلنے شروع ہوئے۔(۱۴)

انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کی زندگی کے بارے میں خدا کی ذات فیصلہ کر دیتی ہے کہ وہ کتنا عرصہ زندہ رہے گا اور یہ فیصلہ اپنے پاس محفوظ کر لیتی ہے اور خود ہی اس پر عمل کرواتی ہے۔کبھی بھی بشر کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی موت کب آئے گی۔اس کے بارے میں مولوی نذیر احمد لکھتے ہیں:

ہم تو ایمان کو ڈانواڈول نہیں ہونے دیتے۔دل میں یہ بات ٹھن گئی ہے کہ اپنی خوشی سے دنیا میں آ نہیں گئے۔خدا نے پیدا کیا ہے اسی نے ہر فرد بشر کی حیات کی ایک مدت مقرر کر دی ہے اور اس مدت کی خبر بھی اپنے ہی تک رکھی ہے، کسی کو اس سے آگہی نہیں۔وقت سے پہلے کوئی مر نہیں سکتا پھر کیوں گھبرائیں اور وعدہ پورا ہوا پیچھے کوئی رک نہیں سکتا تو کس مرنے پر اترائیں **اذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعتہ والا یستقدمون**۔(۱۵)

نظام کائنات کے حوالے سے مولانا نے سورۃ واقعہ کی چند آیات بھی دی ہیں جن میں اولاد، آگ، کھیتی، پانی کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان کو پیدا کرنے والی ذات کون ہے؟ زندگی پیدا کرنا اور پھر اس پر موت واقع کرنا، یہ کس کا کام ہے۔سورۃ واقعہ کی وہ چند آیات جن کو ناول میں شامل کیا گیا ہے۔مثلاً

افرءیتم ما تمنون۔ ءانتم تخلقونہ ام نحن الخلقون۔ نحن قدرنا بینکم الموت وما نحن بمسبوقین۔ علی ان نبدل امثالکم و ننشکم فی مالا تعلمون۔ ولقد علمتم النشاۃ الاولی فلولا تذکرون۔ افرءیتم ما تحرثون۔ءانتم تزرعونہ ام نحن الزرعون۔ لو نشاء لجعلنہ حطما فظلتم تفکھون۔ انا لمغرمون۔ بل نحن محرومون..... فسبح باسم ربک العظیم۔

ان آیتوں میں اللہ نے چار چیزوں کو بیان فرمایا ہے اولاد، کھیتی، پانی اور آگ اور ان چاروں میں سے ہر ایک میں جہاں تک انسان کو دخل ہے .....ہم چاہیں تو کھیتی کو ڈانٹ بتادیں کہ اس میں پھل کا کہیں نام نہ ہو، ہم چاہیں تو پانی کو کھاری کر دیں غرض انسان کا اختیار اور اس کی بے اختیاری

دونوں حالتیں دکھا دی گئی ہیں۔(۱۶)

مولوی نذیر احمد دو کرداروں کے ذریعے اللہ کی شان کو ایسے بیان کرتے ہیں کہ اس ذات نے نظامِ فلکیات کو کیسے چلا رکھا ہے۔ مثلاً

> اجرامِ فلکی کے اتنے بڑے بے شمار گولے کہ خدا کی پناہ اور خود زمین سب چکر میں ہیں۔خدا جانے کب سے اور کیوں اور کب تک اور نہ آپس میں ٹکراتے ہیں اور نہ بال برابر اپنی رفتار بدلتے ہیں .....
> **والشمس تجری لمستقر لها ذلك تقدير العزيز العليم ۔ والقمر قدرنه منازل حتى عاد كالعرجون القديم لا الشمس ينبغي لها ان تدرك القمر ولا الليل سابق النهار وكل في فلك يسبحون۔** (۱۷)

ناول کے آخری صفحات میں مولوی نذیر احمد نے ایک کردار کے ذریعے نبی کریمؐ کی شان کے ساتھ صحابہ کرامؓ اور ان کی پاک زندگیوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔یہاں تک کہ جب بھی جنگ کے لیے مال جمع کروانے کا حکم ملا تو ہر کسی نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق بلکہ بعض نے تو اپنے گھر کی تمام اشیاء لا کر نبی کریمؐ کے سامنے رکھ دیں۔اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

> جنابِ رسالتمآبؐ کے زہد کا حال تو مشتے نمونہ از خروارے میں تم سے بیان کر چکا ہوں۔قریب قریب یہی حال اکثر صحابہؓ کا تھا......جنھوں نے نبی کریمؐ کی رفاقت میں وطن چھوڑا، گھر بار چھوڑا، عزیز و اقارب چھوڑے......ان سے بڑھ کر کیا زہد کرے گا جن پر پیغمبر نبیؐ نے تجہیز جیش کی ضرورت ظاہر کی اور کسی نے سارا اور کسی نے آدھا مال بے تامل لا حاضر کیا......ان سے بڑھ کر کوئی کیا زہد کرے گا جنھوں نے اقصا اپنی حاجتوں پر دوسرے کی حاجتوں کو مقدم رکھا۔(۱۸)

''فسانۂ مبتلا'' نذیر احمد کا ایک دلچسپ اور مکمل ناول ہے۔اس کی دل چسپی اور فن کاری کا راز ان کے فنی شعور میں مضمر ہے۔یہ ناول لکھنے سے پہلے نذیر احمد ''مراۃ العروس''، ''بنات النعش'' اور ''توبۃ النصوح'' تصنیف کر چکے تھے۔فنی لحاظ سے دیکھا جائے تو نذیر احمد کی ناول نگاری کا آغاز درست معنوں میں اسی ناول سے ہوتا ہے۔فسانۂ مبتلا کا قصہ ایک فرد کی بے عنوانیوں اور گمراہیوں سے مرتب ہوتا ہے لیکن نذیر احمد نے اس کے عوامل کو معاشرتی مسائل میں اس طرح پیوست کیا ہے کہ ناول اس دور کی زندگی کا معاشرتی رزمیہ بن جاتا ہے۔تصوراتی سطح پر نذیر احمد نے تربیتِ اولاد، حقوق العباد اور تعدادِ ازدواج کے مختلف مسائل کو ایک فرد کے عوامل سے متعلق کر کے ایک وحدت کی صورت میں پیش کیا ہے۔ان کے علاوہ بعض ذیلی مسائل، معاشرتی عادتوں اور خانگی دقتوں کی نقاشی سے ناول کی موضوعاتی حدود کی توسیع کرنے کی کوشش کی ہے۔

نذیر احمد نے اس دور کی ضروریات سے دوچار ہونے کے لیے جو دستور العمل مرتب کیا، اس میں مذہبی اقدار کی پابندی کو مرکزی حیثیت دی ہے۔ان کا یہ واثق عقیدہ اور مذہب کے ایک مخصوص تصور کے بغیر ممکن نہیں۔مولوی نذیر احمد اس دور سے پیدا شدہ رجحانات اور اثرات کو اعتقادی اور جذباتی لحاظ سے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے جوں ہی خواندہ طبقے پر مذہب کی گرفت قدرے ڈھیلی ہونے لگی تو انھوں نے اسے قومی اور ملی زوال کا پیش خیمہ متصور کیا۔

مولوی نذیر احمد نے اپنے دوسرے ناولوں کی طرح اس میں بھی اسلامی افکار، اقدار اور رسم و رواج کو بیان کیا ہے۔ناول کے شروع ہی میں نذیر احمد نے اللہ تعالیٰ کی وہ صفت بیان کی ہے کہ وہ ایک ذات ہے جس کے قبضۂ قدرت میں ہماری جان، زندگی اور موت ہے۔انسان جو بھی کام اس دنیا میں کرتا ہے، وہ ذات اس کو دیکھ رہی ہے۔چاہے وہ رات کے اندھیرے میں کرے یا چاہے وہ سورج کی روشنی میں کرے، اللہ کی ذات کو سب معلوم ہے۔اس صفت یعنی سمیع و بصیر والی کو یوں واضح کرتے ہیں:

> اور جس طرح بدون اس کے فضل و کرم کے ہم دنیا میں آ نہیں سکتے تھے اسی طرح بغیر اس کی مدد اور حمایت کے ایک لمحہ دنیا میں رہ بھی نہیں سکتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے کہیں اور کسی حالت میں ہوں، ہم اس کی پناہ میں ہیں۔(۱۹)

جب آدمی فوت ہو جاتا ہے تو اس کے لیے افسوس سے ہم قرآنی آیت پڑھتے ہیں۔ اس کی طرف بھی مولوی نذیر احمد نے وضاحت کی ہے:

> اتنا نہیں بن پڑتا کہ گھر میں دو رکعت نماز اطمینان سے پڑھی جائے ناچار میں تو اس مسجد میں چلا جاتا ہوں متقی بھائی کے مرنے کی خبر سن کر قریب تھا کہ چکر کھا وہیں زمین پر گر پڑے مگر آدمی تھا دین دار اس نے **انا للہ و انا الیہ راجعون** کہہ کر ضبط کیا۔(۲۰)

مسلمان اپنی بخشش کے لیے بے تاب رہتا ہے کیونکہ اس کو یقین ہے کہ جو بھی وہ عمل کر رہا ہے اس کا اسے جواب دینا ہے اسی طرح مسجد میں رہ کر اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ اس فکر کی عکاسی مصنف نے یوں کی ہے:

> پھر خیال کیا کہ پاس کے پاس اسی مسجد میں ٹھہر جانا مناسب ہے کہ بڑے میاں سے اور حالات بھی دریافت ہوں گے۔ مسجد میں گیا اور وضو کر کے نماز پڑھی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، بھائی سے اس کو محبت تھی بہت یوں بھی ہمیشہ غائبانہ اس کے حق میں دعائے خیر کیا کرتا تھا۔ اب حضرت موسیٰ کی دعا اس کو یاد آئی اور اس کے منہ سے نکلا **رب اغفرلی ولاخی وادخلنا فی رحمتک وانت ارحم الراحمین**۔ جی بھر آیا اور بے اختیار اتنا رویا کہ ہچکی بندھ گئی۔(۲۱)

مولوی نذیر احمد ایک کردار کے ذریعے دوزخ کی آگ کے بارے میں بات کرتے ہیں کہ اے اللہ! دوزخ کے عذاب سے بچانا وہ ایسے دعا کرتا ہے:

> الٰہی توبہ الٰہی توبہ خدا دوزخ کی آنچ سے بچائے اور بھانڈوں کو بھوت بنائے، آسیب بنائے، جو چاہے سو کرے مگر دوزخ کے کندے نہ بنائے۔ بھلا پھر یہ حاجی چاہتے کیا ہیں ''دوسرا'' چاہتے یہ ہیں کہ نمازیں پڑھو روزے رکھو خدا کی بندگی کرو، جو روپیہ رنڈیوں اور بھانڈوں کو دیتے ہو، غریبوں اور محتاجوں کو دو۔(۲۲)

خدا کی ذات وہ ذات ہے جو پوری کائنات پر قادر ہے۔ کائنات کا ہر کام اسی کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ سورج پہلے غروب نہیں ہو سکتا۔ دن پہلے نہیں آ سکتا، رات پہلے جا نہیں سکتی۔ اسی طرح جو بھی کام ہو، وہ صرف اور صرف اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے مولوی نذیر احمد یوں رقم طراز ہیں:

> اگر خدا نہ چاہے تو کیا بندے آپ سے آپ پیدا ہو جائیں اور اپنے اختیار سے زندگی بسر کریں۔ ایسا خیال کرنا تو کفر کے علاوہ غلط صریح بھی ہے۔ بندے بھلے اور برے امیر اور غریب قوی اور ضعیف، حاکم اور محکوم، بادشاہ اور رعیت، یہاں تک کہ ولی اور پیغمبر سب کے سب اس قدر عاجز اور بے اختیار ہیں کہ بدون خدا کی مرضی کے ایک پتا ہلانا چاہیں تو نہیں ہلا سکتے۔ ایک ذرے کو جگہ سے سرکانا چاہیں تو نہیں سرکا سکتے۔ کسی انسان کا نفع و نقصان نہ خود اس کے اختیار میں ہے۔(۲۳)

ناپ تول میں کمی و بیشی کرنے والوں کے لیے اللہ نے قرآن میں سخت وعید سنائی ہے اور ان کا ٹھکانہ جہنم قرار دیا ہے۔ اس بارے میں مصنف نے قرآنی آیتوں کے ساتھ دلائل دیے ہیں:

ویل للمطففین الذین اذا اکتالو علی الناس یستوفون واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون الایظن اولئک انھم مبعوثون لیوم عظیم یوم یقوم الناس لرب العالمین۔

> افسوس ہے ڈنڈی ماروں پر کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتا ہوتو پورا پورا کریں اور جب کو ناپ کر یا تول کر دینا پڑے تو ان کو گھاٹا پہنچائیں۔ کیا یہ لوگ اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ ایک بڑا دن آنے والا ہے اور اس دن ان سب کو مر کر اٹھنا ہوگا۔ اس دن لوگ پروردگار عالم کے روبرو کھڑے ہوں گے۔ (۲۴)

اس دنیا کا اختتام ایک ایسے دن پر ہونے والا ہے جس دن اس کائنات کی مالک ذات خود منصف کا اختیار استعمال کرے گی اور کسی بھی نفس کا کیا ہوا سب کچھ سامنے ہوگا۔ خیر اور بد کا فیصلہ ہوگا۔ خیر کے لیے جنت کا پیغام ہوگا اور بد کے لیے دوزخ کا پروانہ دیا جائے گا اور خدا کی ذات خود فیصلے فرمائے گی، اس کے بارے میں مصنف یوں رقم طراز ہیں:

> خدائی فیصلوں کے لیے ایک دن مقرر ہے یعنی روز قیامت کہ اس دن اللہ جل وعلا شانہٗ عدل و انصاف کے تخت پر اجلاس فرمائے گا اور نیک اور بد، نجی اور شوم اور ظالم اور مظلوم سب کا اخیر چکوتا کر دے گا۔ **فریق فی الجنۃ و فریق فی السعیر**۔ (۲۵)

ناول میں ایک جگہ پر حقوق اللہ اور حقوق العباد کے بارے میں بتاتے ہیں کہ حقوق اللہ کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن حقوق العباد کا معاملہ کافی سنجیدہ ہے اس بارے میں لکھتے ہیں:

> اللہ کے حقوق ضائع ہوں اور بھی سے ہوتے ہیں تو بندے کا خدا سے کیا مقابلہ حقوق الٰہی کا ضیاع اکثر سہو اور غفلت اور نادانی اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے ہوتا ہے اور اُمید ہے خدا غفور و رحیم بندوں کے ضعف پر نظر فرما کر ان کے قصور معاف کرے گا مگر حقوق العباد کا یہ حال نہیں ہے اس میں ایک بندہ زور سے ظلم سے، ہیکڑی سے، زبردستی سے دوسرے کو ستاتا، اس کا دل دکھاتا ہے اس کو ایذا پہنچاتا ہے اور اس قصور کا معاف نہ کرنا اسی بندہ مظلوم کے اختیار میں ہے..... نکیرین کے ساتھ سوال و جواب کا ہونا برحق، قیامت برحق، مرنے کے بعد پھر زندہ ہونا برحق، رتی رتی کا حساب دینا، جنت برحق، دوزخ برحق۔ (۲۶)

مولوی نذیر احمد نے دو کرداروں کے درمیان میں جو درج ذیل گفتگو کروائی ہے اس سے مختلف موضوعات جنم لیتے ہیں لیکن اسلامی احکام کی پاسداری بھی مثلاً:

> اب وہ معمہ حل ہوا کہ حقیقت میں وہ یہ دنیا ہے جیسی ناظر کی تھی جس میں حلال و حرام کا امتیاز نہیں، جائز و ناجائز کا تفرقہ نہیں، خدا اور رسول کا خوف نہیں، روز قیامت کا اندیشہ نہیں، ناظر کی اتنی ہی باتوں سے حاضر کو پورا یقین ہو گیا کہ اس کو سمجھانا یا اس کے ساتھ بحث کرنا محض بے سود و لاحاصل ہے۔ (۲۷)

نبی کریمؐ فرماتے ہیں کہ اگر تیرے ساتھ کوئی آدمی بُرائی کرتا ہے تو اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک ہرگز نہ کر بلکہ تو اس کے ساتھ بھلائی سے پیش آ، یہی حکم قرآن پاک میں بھی ملتا ہے اور جس کی تبلیغ نذیر احمد نے اپنے اس ناول میں کی ہے:

> **ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمید**
>
> یعنی اگر تجھ سے کوئی برائی کرے تو بھلائی کے ساتھ اس کو تو ذکر لو اور پھر دیکھ کر یا تو تجھ میں اور اس میں دشمنی تھی یا بات کی بات میں وہ تیرے ساتھ گرم جوشی کرنے لگا۔ (۲۸)

ناول میں حضرت موسیٰؑ کا وہ واقعہ بھی بیان کیا ہے یعنی جب اہل یہود موسیٰ سے بار بار اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ آپ کس خدا کی عبادت کرتے ہیں وہ کیسا خدا ہے جو نہ تو سامنے نظر آتا ہے اور نہ ہی اپنے بندوں سے باتیں کرتا ہے اور پھر اسی خدا کی بندگی کے لیے ہمیں کہتے ہو۔ یہ وجہ آج کل کے مسلمانوں میں بھی ہے۔ اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> حضرت موسیٰ سے بھی یہود ایسی ہی بے جا فرمائش کرتے تھے۔ **لن نومن لک حتی نری اللہ**

> جھسرق۔ ہم تو جب تک خدا کے کھلے تڑ انے نہ دیکھ لیں تجھ پر ایمان لانے والے ہی نہیں لیکن مذہب کے لیے ایسے ثبوت کا ہم نہ پہنچ سکنا ضعف مذہب کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ انسان کے ضعف خلقت کے سبب کیا اگر موسیٰ کا خدا دیدار یہود کو نہ دکھا سکے تو اس سے لازم آ گیا کہ خدا نہیں ہے۔ نہیں خدا تو ہے مگر وہ آدمی کی آنکھ میں آنے کی چیز نہیں ہے۔(۲۹)

اس دنیا کا وجود میں آنا کافر اور مسلمان دونوں کے لیے ایک جیسا ہے لیکن کافر کے لیے یہ دنیا جنت ہے اور مسلمان کے لیے یہ دنیا جہنم سے کم نہیں۔ دونوں کے لیے اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے دونوں کے لیے سورج کی دھوپ ہے۔ دونوں کے لیے چاند کی چاندنی ہے دونوں کے لیے بارش ہے۔ مسلمان اور کافر سب کے لیے گرمی اور سردی ہے۔ ہر کوئی اپنی اپنی استطاعت کے مطابق فائدہ اُٹھاتا ہے۔ مثلاً

> تو ضرور رحمت اس کی دست گیری کرے گی۔ والدین جاھدوفینا لنھد ینھم سبلنا لوگ مذہب کی طرف سے جو اس قدر غافل اور مغرور بن رہے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خدا نے اپنے بندوں کی آزمائش کے لیے دنیا کا انتظام ایسے طور پر رکھا ہے کہ دنیا والے حالات کے اعتبار سے نیک و بد اور پابند مذہب اور لا مذہب اور مومن و کافر موحد و مشرک کسی کا کچھ امتیاز نہیں۔ خدا کی عام رحمتوں سے سب کے سب بلا تخصیص یکساں طور پر متمتع ہوتے ہیں۔ وقت پر پانی سب کے واسطے برستا ہے ہوا کا ذخیرہ سب کے لیے موجود ہے۔ رزق ہر ایک کی خاطر مہیا ہے صحت و مرض، تمول و افلاس، توالد و تناسل، حیات و موت، غرض زندگی کی بھلی بری تمام کیفیتیں، جیسی مسلمانوں میں ویسی عیسائیوں میں۔(۳۰)

مولوی نذیر احمد نے ناول ''فسانہ مبتلا'' کی فصل انیس میں مبتلا اور عارف کا تعدد نکاح کے بارے میں مباحثہ درج کیا ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ اگر تم زیادہ بیویوں کے درمیان عدل نہ کر سکو تو تمھارے لیے ایک ہی کافی ہے۔ ہاں اگر عدل و انصاف کو پورا کرو گے تو بے شک اسلام نے اجازت دی ہے۔ اس مباحثے میں مولوی نذیر احمد نے قرآنی آیات کا حوالہ دیا ہے جو کہ دوسرے پارے سے لی گئی ہیں۔ اس بارے میں ایک پورا رکوع ہی طلاق کے موضوع پر ملتا ہے جس کو مولوی نذیر احمد یوں لکھتے ہیں:

> مگر تعدد نکاح کی سند تو قرآن کی وہی ایک مشہور آیت ہے وان خفتم الاتقسطو فی الیتمیٰ فانکحو ماطاب لکم من النساء مثنیٰ وثلث وربع عارف اسی کے آگے فرماتے ہیں فان خفتم الاتعدلو فواحدۃ یعنی اگر تم کو یہ خوف ہو کہ متعدد بیبیوں میں برابری نہ کر سکو گے تو ایک ہی بی بی کرو اور اسی سورۃ اور اسی پارے میں آگے چل کر ولن تستطیعو ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم فلا تمیلو کل المیل فتذروھا کالمعلقہ (یعنی تم بہتیرا چاہو مگر تم سے یہ ہو ہی نہ سکے گا کہ عورتوں میں برابری کر سکو پس سارے کے سارے بھی ایک طرف کو مت جھک جاؤ کہ اس بچاری کو ادھر میں لٹکتا ہوا چھوڑ دو) اب ان دونوں باتوں کو ملاؤ کہ برابری نہ کر سکو تو ایک کرو اور تمھارے کیے برابری ہو ہی نہ سکے گی۔(۳۱)

آگے چل کر نبی کریمؐ کے نکاح مبارک کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں جو کہ سورۃ احزاب میں درج ہے:

> یا ایھا النبی انا احللنا لک ازواجک الاتی اتیت اجورھن ..... پیغمبر صاحب کے لیے چار بیبیوں کی قید نہ تھی اور اگرچہ آں حضرت ازواج مطہرات میں اپنی طرف سے عدل فرماتے تھے مگر خدا نے ان پر اس کو بھی لازم نہیں کیا تھا چنانچہ اسی رکوع میں یہ آیت ہے ترجی من تشاء منھن وتوی الیک من تشاء ومن ابتغیت ممن عزلت فلا جناح علیک (یعنی اپنی بیبیوں میں سے جس کو چاہو اپنے سے جدا رکھو اور جس کو چاہے اپنے پاس جگہ دو اور

جس کو چاہو بٹھا کر پھر بلا لو تو تم پر کچھ گنا نہیں)۔(۳۲)

سورۃ البقرہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف والرجال علیھن درجہ (یعنی جیسے عورتوں کی ذمہ داریاں ہیں ویسی ہی راست معاملگی کے ساتھ ان کے حقوق بھی ہیں اور مردوں کو عورتوں پر برتری ہے) پھر سورۃ نساء میں ہے عاشروھن بالمعروف فان کرھتموھن فعی ان تکرھو شیٔاو یجعل اللہ فیہ خیرا کثیرا (یعنی عورتوں سے راست معاملگی کے ساتھ برتاؤ کرو، پس اگر وہ تم کو بھلی نہ لگیں تو عجب نہیں تم کو ایک چیز بھلی نہ لگے اور خدا اس میں بہت سی بہتری کر دے۔(۳۳)

ناول کے آخر میں مولوی نذیر احمد نے عارف کے مرثیے کے چند بند دیے ہیں جو صحیح معنوں میں اسلامی احکام، افکار، رسم و رواج کے ساتھ ساتھ اسلامی روایات کی عکاسی کرتے ہیں:

اعمال نیک ہیں تو زمرد کے ہیں قصور　　　خدمت کو لونڈیوں کی جگہ دست بستہ حور
ہر طور کا ہے عیش تو ہر طرح کا سرور　　　یعنی خلاصہ یہ ہے کہ راضی ہوئے حضور
خوشنودی خدا اہی عبادت کا دام ہے
جنت بھی اِک رضائے الٰہی کا نام ہے(۳۴)

آگے لکھتے ہیں:

پھر بعد مرگ کیسی بنے کچھ خبر نہیں　　　یہ وہ خطر ہے جس سے کسی کو مفر نہیں
پر کیا ہی ڈھیٹ ہم ہیں کہ اس کا بھی ڈر نہیں　　　عقل معاد سے ہمیں بہرہ مگر نہیں
رب العباد لعنت فکر معاد دے
فکر معاد دے ہمیں ذکر معاد دے(۳۵)

شرک کے بارے میں بند ہے:

اب بھی جو دیکھتے ہو انھیں کا طفیل ہے　　　کم و بیش سب کو جانب توحید میل ہے
اعمال و شرک جوں خس وخاشاک اور سیل　　　اتنا بھی گر نہ سمجھے تو انسان بیل ہے
مشرک کی کوئی شے نہیں کرتا خدا قبول
اس کی دعا قبول نہ کچھ التجا قبول (۳۶)

مولوی نذیر احمد نے اپنے دوسرے ناولوں کی طرح ''بنات النعش'' میں بھی ایک دینی عالم کی صورت میں وارد ہوئے ہیں۔ان کے ناولوں میں زیادہ تر قرآنی آیات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔یہ اس لیے بھی ہے کہ مولوی صاحب عربی زبان کے عالم تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک دیندار آدمی تھے۔انھوں نے قرآن وحدیث کے حوالے سے کافی معاملات کو حل کرنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔دیکھا جائے تو بعض جگہ پر ان کے مکالمے ضرورت سے زیادہ طویل ہو جاتے ہیں۔یہ بالعموم ان موقعوں پر ہوتا ہے جہاں مذہبی امور زیر بحث آتے ہیں۔اس کا سبب نذیر احمد کا اصلاحی مشن اور مذہبی ذہن تھا۔

''بنات النعش'' میں نذیر احمد نے اس اسلامی روایت کے بارے میں اشارہ کیا ہے کہ جب بھی کوئی بچہ تعلیم شروع کرتا تو اس کی برکت کے لیے قرآن پاک کی کچھ آیات پڑھ کر پانی پر پھونکی جائیں پھر اس پانی یا میٹھی چیز کو تبرک کے طور پر بچوں کو کھلایا جاتا تھا۔لکھتے ہیں:

بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ پڑھوائی آپ سے لوں سلطانہ بیگم نے کہا استغفر اللہ پڑھوائی دینے کے واسطے ہمارا

کیا مضائقہ ہے بسم اللہ کی مٹھائی ہے اصغری نے کہا شروع میں تبرک کے واسطے سیر آدھ سیر مٹھائی کافی ہے۔ یہ
کہہ کر دریافت کی...... اصغری نے خود فاتحہ پڑھ کر پہلے حسن آرا کو دی اور پھری قاب دیانت کو اٹھا دی کہ سب
بچوں کو بانٹ دو۔(۳۷)

حسن آرا اور محمودہ کے درمیان نیکی اور عزت کے حوالے سے بات ہوتی ہے کہ عزت اور ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ عزت دولت سے نہیں ہوتی اور نہ ہی عزت دولت سے خریدی جا سکتی ہے بلکہ دوسرے لوگوں کے ساتھ نیکی کرنا ہی عزت ہے۔ اس بارے میں محمودہ کہتی ہے:

ہاں بس یہی غلطی ہے یہ ماما اس اوقات کی نہیں ہے غریب تو ہے مگر عزت دار ہے۔ بے شک آپ کے نزدیک
دولت ہی عزت ہے اور میرے نزدیک بلکہ خدا رسولؐ کے نزدیک، دنیا کے عقلمندوں کے نزدیک نیکی بڑی
عزت ہے۔(۳۸)

ایک اور جگہ پر محمودہ کہتی ہے کہ دل آزاری کرنا سب سے بڑا گناہ ہے اور دل جوئی کرنے سے بڑی کوئی نیکی نہیں ہے۔ اس کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

اس میں شک نہیں بڑے حوصلے اور بڑی سیاست کی بات آپ نے کی جو سنے گا خوش ہوگا اور تعریف کرے گا
اور خدا کی درگاہ میں تو اس کا اجر اتنا بڑا ہے کہ دنیا کی کوئی نعمت اس کی برابری نہیں کر سکتی جتنی کتابیں آج تک
میں نے پڑھی ہیں سب میں یہی لکھا ہے کہ دل آزاری سے بڑھ کر دنیا میں کوئی گناہ نہیں اور دل جوئی سے
بڑھ کر نیکی نہیں۔(۳۹)

حسن آرا اور محمودہ کی بحث اس بات پر بھی ہوتی ہے کہ بار بار خدا کی قسم کھانا اور اس کا نام ایسے ہی غلط استعمال میں لانا خدا کی ناراضگی کی وجہ بنتا ہے۔ حسن آرا کہتی ہیں کہ اذان میں بھی بار بار خدا کا نام لیا جاتا ہے۔ مکالمہ یوں ہے:

محمودہ آپ کو اس دو جہان کے مالک اور بادشاہ کا نام اس بے احتیاطی سے لیتے ہوئے ڈر نہیں لگتا۔ یہ دیکھیے
دنیا کی بے ایمانی کہ آدمی آدمی کا ادب کرے تو اس کا نام نہیں لیتا اور خدا کی یہ بے توقیری اور بے قدری کہ بات
بات میں اس کا نام لیا جائے......

حسن آرا، خدا کا نام لینا منع ہوتا تو اذان اور نماز میں کیوں لیتے محمودہ عبادت میں نام لینا دوسری بات
اور خدا کے نام کو تکیہ کلام قرار دینا اور جا بجا بول اٹھنا بالکل خلاف ادب ہے۔(۴۰)

قیامت والے دن ہر شخص نے اپنے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ کوئی بھی کسی کی جگہ نہ بول سکے گا۔ چاہے کسی کا بیٹا ہو یا بیٹی یعنی اس دن کوئی بھی رشتہ کام نہیں آئے گا تو اس لیے دنیا میں جو لوگ اس بات پر غرور کرتے ہیں کہ ہم بڑے ولی کے بیٹے ہیں تو ان کو نبی کریمؐ کا فرمان یاد رکھنا ہوگا جو خیر النساء اور استانی جی کے مکالمہ کی صورت میں مولوی نذیر احمد نے یوں لکھا ہے:

پھر حسن آرا بیگم کی امیری ناحق اعتراض ہے۔ ان کو امیری کا گھمنڈ تو کسی قدر جائز بھی ہے۔ ان کو خدا نے
دولت تو دے رکھی ہے تمھارے پاس نری شیخی کے سوا اور کیا ہے اور خدا کے یہاں تو اس کی پرسش ہی نہیں۔
دیکھو اس زمانے کی سیدانیاں اپنے تئیں کتنا دور کھینچتی ہیں اور پیغمبر صاحب نے اپنی بیٹی فاطمہؓ کو جن سے
سیدوں کی جڑ بنیاد ہے بلا کر فرمایا کہ اے فاطمہؓ اس دھوکے میں مت رہنا کہ میں پیغمبرؐ کی بیٹی ہوں بلکہ عاقبت
کے لیے سامان کر جب خود فاطمہؓ کا یہ حال ہے تو اب اور کس گنتی میں ہیں۔(۴۱)

ناول کے آخر میں حسن آرا اور محمودہ وغیرہ سب کر دار مل کر دعا کرتے ہیں جس کو مولوی نذیر احمد نے یوں ظاہر کیا ہے:

آؤ سب مل کر اس خدا کی درگاہ میں دعا کریں کہ ہم سب کو نیک عمل کی توفیق دے (ہر طرف سے آمین آمین کا

> شور ہوا) دنیا کے میکے اور سسرالیں تو چند روزہ باتیں ہیں الٰہی اس جہان میں جہاں سدا سدا کا رہنا ہے پردہ رکھ لیجیو اور فضیحت مت کیجیو ۔۔۔ الٰہی یہ تیری کنیز جس کو ہم لوگ حسن آرا بیگم کہہ کر پکارتے ہیں منزل دنیا جس کو تیرے حکم سے ہم سب طے کر رہے ہیں، شروع کرنے والی ہے۔ تیرا فضل و کرم اس کا حافظ، تیری توفیق اور اس کا بدرقہ، تیری عنایت و مہربانی، اس کی زادِ راہ ہو (سب کو رقت ہوئی اور سب نے کہا آمین) (۴۲)

اُردو ادب کو مضبوط بنیاد فراہم کرنے والے منشی پریم چند کے ناول اردو ادب کے ساتھ ساتھ زندہ رہیں گے۔ پریم چند کے ناول اپنے عہد کے سماجی اور سیاسی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر معاشرتی مسئلے پر روشنی ڈالتے اور اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کی کہانیاں اپنے زمانے کا بھرپور تاریخی شعور لیے ہوئے ہیں۔ ان کہانیوں میں سماجی، سیاسی اور معاشرتی حوالے سے حقیقی تصویریں ملتی ہیں جو اپنے مخصوص ماحول میں جیتی جاگتی اور متحرک نظر آتی ہیں۔

پریم چند نے جب ناول نگاری کا آغاز کیا تو اس وقت آزادی کی تحریکیں سر اُٹھا رہی تھیں۔ لوگ سیاسی طور پر باشعور ہو چکے تھے۔ اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے کی دبی دبی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن ایک طبقہ ایسا بھی تھا کہ جس کو صرف ظلم سہنا تھا اور ان کو ایک عام شہری کے کسی قسم کے حقوق حاصل نہ تھے۔ پریم چند نچلے اور پسے ہوئے طبقے کی آواز حکمرانوں تک پہنچانے کے آرزو مند تھے۔

پریم چند جاگیرداروں، سرمایہ داروں، صنعتکاروں سے برسرِ پیکار ہیں جو محنت کشوں کا خون چوستے ہیں لیکن معاوضہ ان کے ایک پسینے کے قطرے کے برابر بھی ادا نہیں کرتے۔ پریم چند نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دیہات میں گزارا تھا وہ دیہاتیوں کے مسائل اور مشکلات سے پوری طرح باخبر تھے بلکہ وہ خود بھی ایسے ہی حالات سے دوچار رہے۔ پریم چند نے فن اور زندگی کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا بلکہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی زندگی سے کہانیاں اور کردار منتخب کر کے امراء اور حکمران طبقے کے سامنے رکھتے تھے۔

ڈاکٹر اے۔ بی اشرف لکھتے ہیں:

> زندگی اور فن کا صحیح امتزاج ان کے یہاں مقصود ہے۔ منشی پریم چند پہلے ادیب ہیں جنھوں نے زندگی اور فن کو ایک توازن اور امتزاج کے ساتھ برتا۔ پریم چند کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز زندگی کے مسائل سے ان کی گہری واقفیت اور انسان دوستی کے مسلک میں پوشیدہ ہے۔ (۴۳)

پریم چند کی ناول نگاری پر بات کرتے ہوئے پروفیسر ممتاز حسین لکھتے ہیں:

> اگر ایک طرف ادب کو زندگی کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے کہ وہ کیونکر اسے منعکس کرتا ہے تو دوسری طرف اس کے تخیلی روپ کو بھی دیکھنا چاہیے۔ منشی پریم چند کا ادب ہندوستانی سماج کی تاریخ کا ایک تخیلی آئینہ ہے...... ان کا یہ آرٹ زندگی سے اس قدر قریب ہے کہ وہ اس کی قربت میں خود کو بھول جاتے ہیں بلکہ اس کی سچائی کو بروئے کار لانے میں خود کو مٹا دیتے ہیں۔ (۴۴)

منشی پریم چند کا دوسرا ناول جو حقیقت نگاری اور مقصد کی ایک زندہ مثال ہے "میدانِ عمل" ہے۔ میدانِ عمل جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ نظریات اور افکار کو عملی جامہ پہنانے کی ایک کاوش ہے۔ پریم چند نے "میدانِ عمل" میں قربانی کے ذریعے باتوں کو رنگ دیا ہے۔ امیروں کا، غریبوں کی آرام و آسائش چھوڑ کر غریبوں کے رنگ میں رنگ جانا اور ان کے حقوق کی خاطر اپنی جان دینا، اس ناول کا موضوع ہے۔ وہ اپنے اس ناول کے ذریعے ان لوگوں کو میدانِ عمل میں لانا چاہتے تھے جو محض غریبوں کے حقوق کی باتیں کرتے تھے۔ پریم چند کی ناول نگاری مختلف تحریکوں کے زیرِ اثر رہی۔ جمیل ملک لکھتے ہیں:

> جس وقت میدانِ عمل لکھا گیا اس وقت ہندوستان کے عوام ہوم رول اور ڈومینین سٹیٹس سے بڑھ کر مکمل

آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے..... سیاسی اور سماجی تحریکیں شہروں سے نکل کر دیہاتوں میں پہنچ چکی تھیں۔ ایک طرف ملک کے یہ حالات تھے کہ تو دوسری طرف بین الاقوامی طور پر انقلاب روس کی وجہ سے سیاسیات میں کسان اور مزدور طبقے کی راہبری تسلیم کی جا چکی تھی۔(۴۵)

''میدان عمل'' ۱۹۳۲ء میں لکھا گیا۔عدم تعاون، بائیکاٹ اور سول نافرمانی کی تحریکیں اپنے شباب پر تھیں۔ میدان عمل کی کہانی ایک نوجوان امرکانت کی کہانی ہے جو ایک امیر سود خور کا بیٹا ہے اور اپنے باپ کی دولت کی اسے کوئی پروا نہیں اور نہ ہی وہ اپنے باپ کے کاروبار میں دلچسپی لیتا ہے۔ باپ اس کی شادی سکھدا سے کرواتا ہے۔ لڑکی بہت اچھی اور سمجھدار ہوتی ہے وہ اس کی دلچسپی باپ کے کاروبار میں پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن یہ سب کچھ زیادہ دیر نہ چل سکا۔ امرکانت بیوی کو دولت پرست سمجھتا ہے۔ ایک بیٹے کی پیدائش کے بعد اپنے باپ کی ایک وظیفہ خوار پٹھانی کی بیٹی کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اپنے نفس پر قابو پا کر اور ایک مسلمان دوست سلیم کے سمجھانے پر کہ مذہب کی وجہ سے تم اور سکینہ شادی نہیں کر سکتے، سب کچھ چھوڑ کر گھر سے نکل جاتا ہے اور گاؤں گاؤں گھوم پھر کر لوگوں کی مدد کرتا ہے۔

ان تمام واقعات کے باوجود ناول میں کئی جگہ پر ہندو اور مسلم مذہب پر بھی گفتگو ہوتی ہے۔ دونوں کردار اپنے اپنے مذہب کے حوالے سے دلیلیں دیتے ہیں مثلاً امرکانت اور پٹھانی کے نکاح کے حوالے سے پریم چند یوں گفتگو کرتے ہیں:

> مجھے تو صرف ایسا لڑکا چاہیے کہ جو شریف خاندان کا ہو اور شریف مزاج ہو۔ میں دولت کی قائل نہیں ہوں حالاں کہ ہمارے رسولؐ کا حکم ہے کہ نکاح میں امیر اور غریب کا امتیاز مٹا دیا جائے لیکن ان کا حکم اب کون مانتا ہے نام کے مسلمان اور نام کے ہندو رہ گئے ہیں۔ نہ کہیں سچا مسلمان نظر آتا ہے نہ سچا ہندو۔(۴۶)

ناول میں اکثر جگہ پر اللہ سے دعائیں مانگتے ہوئے مختلف کردار سامنے آتے ہیں۔ مثلاً:

> بڑھیا نے اندر آ کر کہا اللہ کرے جگ جگ جیے اور میری عمر پائے کیوں بیٹا سارے شہر کو نیوتا ہو اور ہم پوچھے تک نہ گئے کیا ہم ہی سب سے غیر تھے اللہ جانتا ہے جس دن یہ خوش خبری سنی دل سے یہی دعا نکلی کہ بچے کی عمر دراز ہو۔(۴۷)

مزید آگے لکھتے ہیں:

> بڑھیا دبے پاؤں آنگن سے ہوتی ہوئی سامنے کے برآمدے میں پہنچی اور بہو کو دعائیں دیتی ہوئی بچے کو دیکھ کر بولی! کچھ نہیں بیٹا نظر کا فساد ہے۔ میں ایک تعویذ دیے دیتی ہوں اللہ چاہے گا تو ہنسنے کھیلنے لگے گا۔(۴۸)

پریم چند نے ایک جگہ پر دو کرداروں یعنی امرکانت اور سلیم کے درمیان اسلام کے قبول کرنے کے بارے میں مکالمے لکھتے ہیں امرکانت پٹھانی کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہے اور یہ دونوں مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں:

> سلیم نے پوچھا، بالفرض وہ کہے تم مسلمان ہو جاؤ..... تو میں اسی وقت ایک مولوی کو بلا کر کلمہ پڑھ لوں گا۔ مجھے اسلام میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جسے میرا ضمیر قبول نہ کرتا ہو۔ سارے مذہبوں کی حقیقتیں ایک ہیں حضرت محمدؐ کو خدا کا رسول ماننے میں مجھے کوئی عذر نہیں۔ حسن خدمت، ایثار، رحم اور تہذیب نفس پر ہندو مذہب کی بنیاد قائم ہے اسلام مجھے بدھ، کرشن اور رام کا احترام کرنے سے نہیں روکتا۔(۴۹)

اللہ کی صفات کے بارے میں کالے خاں اور امرکانت یوں گفتگو کرتے ہیں:

> معلوم ہوتا ہے تمھاری خدمت کے لیے ہی اللہ نے مجھے یہاں بھیجا ہے وہ تو بڑا کارساز ہے۔ اس کی قدرت کون سمجھ سکتا ہے۔ آپ ہی آدمی سے برائی کرواتا ہے۔ آپ ہی سزا دیتا ہے۔ آپ ہی اسے معاف بھی کر دیتا ہے۔

امر کانت نے اعتراض کیا کہ برائی خدا نہیں کرواتا ہم خود کرتے ہیں۔تم نے تو پڑھا ہو گا کہ اس کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں مل سکتا۔ برائی کون کرے گا سب وہی کرواتا ہے اور پھر معاف بھی کر دیتا ہے۔ ابھی میں یہ بات منہ سے کہہ رہا ہوں جس دن میرے ایمان میں یہ بات جم جائے گی، اسی دن برائی بند ہو جائے گی......

اب سوچتا ہوں کہ اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ زندگی میں اتنے گناہ کیے ہیں کہ جب ان کی یاد آتی ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اب تو اسی کی رحیمی کا بھروسہ ہے۔(۵۰)

اسلام ہمیشہ ظلم سے روکتا ہے اور مظلوم کی مدد کرنے کا سبق دیتا ہے کیونکہ اسلام میں تمام انسان بھائی بھائی ہیں اور ایک اینٹ کی مانند ہیں۔اسی اسلامی فکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پریم چند لکھتے ہیں:

تم مسلمان ہو کر ایسی باتیں کرتے ہو۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ اسلام نے ہمیشہ مظلوموں کی مدد کی ہے اور تم مظلوموں کی گردن پر چھری پھیر رہے ہو..... آپ تو مسلمان ہیں کیا آپ کا فرض نہیں ہے کہ آپ سرکار کی مدد کریں۔ آپ اہلِ کتاب کے مقابلے میں کافروں کی مدد کر رہے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے۔ اگر مسلمان ہونے کا یہی مطلب ہے کہ غریبوں کا خون کیا جائے تو میں کافر ہوں۔(۵۱)

مولانا عبدالحلیم شرر عربی و فارسی کے عالم تھے اور تاریخ سے آپ کو خاصا لگاؤ تھا۔ آپ نے انگلستان اور یورپی ممالک کی سیاحت بھی کی تھی۔اس سفر کے سلسلے میں آپ نے وہ آثار اصنادید بھی دیکھے تھے جن سے ان ایام گزشتہ کی یاد تازہ ہوتی تھی جب عرب کا پرچم صیقلہ و اندلس میں لہراتا تھا۔ آپ نے اسی دوران میں سر والٹر اسکاٹ کے وہ نام نہاد تاریخی ناول بھی دیکھے جن میں اسلام کا مضحکہ اڑایا گیا ہے اور عیسائیت کا فروغ دکھایا گیا ہے۔مختصر یہ کہا جائے کہ مورخانہ ذوق، قبولیت عام کی خواہش، مذہبی جوش اور مسلمانوں کے احیاء کا خیال، شرر کے تاریخی ناول لکھنے کا محرک بنا۔شرر نے مسلمانوں کو ان کے قدیم کارنامے یاد دلا کر موجودہ تنزل کے اسباب پر غور کرنے کی طرف مائل کرنا چاہا۔ اس لیے آپ نے کبھی صلیبی جنگوں کے معرکے ''ملک العزیز، ورجینا اور''شوقین ملکہ'' میں یاد دلائے۔کبھی رسویوں پر ترکوں کی فتح ،حسن انجلینا'' میں دہرائی اور کبھی ''فردوسِ بریں'' میں فرقہ باطنیہ کی ملکی و مذہبی جنگ کے خاکے پیش کیے اور جیتے جی جنت کی سیر کروائی۔

شرر کا ناول ''فردوسِ بریں'' پلاٹ، مکالمے، کردار نگاری اور مناظر کی مرقع کشی حتیٰ کہ ہر طرح سے ایک مکمل ناول ہے۔اس کے کرداروں میں سے حسین کا کردار ارتقائی منزلوں سے گزرتا ہوا کردار ہے۔زمرد کا یہ دیوانہ اس کا جنتی خط پا کر حد درجہ پر حول طریقے پر ریاضت کرتا ہے۔

شرر نے اس ناول میں تاریخ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ فرقہ باطنیہ اور مسلمانوں کے بارے میں کافی دلچسپ بحث کی ہے اور اس بحث سے اسلامی اقدار کھل کر سامنے آتی ہیں اور انھوں نے خود اس بات کا اقرار کیا ہے کہ ناول کے ذریعے ہی اخلاقی تعلیم دی جا سکتی ہے۔اخلاق کی تعلیم دینا بھی اسلامی افکار میں شامل ہے۔وہ لکھتے ہیں:

اخلاقی تعلیم دینے کا اس سے زیادہ دلچسپ طریقہ آج تک دنیا کو معلوم نہیں ہوا اور ساری قوم نے تسلیم کر لیا ہے کہ ناول ہی اخلاق کے اصلی مصلح ہو سکتے ہیں۔(۵۲)

مذہب اسلام میں قبر کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور لوگ قبروں پر جا کر فاتحہ خوانی کرتے ہیں تا کہ وہ دوسرے مسلمان جو فوت ہو چکے ہیں، ان کے لیے ایصالِ ثواب کر سکیں۔اسی اسلامی روایت کو شرر نے یوں واضح کیا ہے:

اس آواز کے سنتے ہی حسین بھی ادھر دوڑ آگیا اور دیکھا کہ ایک چٹان پر موسیٰ کا نام کھدا ہوا ہے اور اس کے قریب بھی چند پتھروں کو برابر کر کے ایک قبر کی صورت بنا دی گئی تھی۔ دونوں نے یہاں پر کھڑے ہو کر فاتحہ خوانی کی مگر زمرد کے دل پر حسرت و اندوہ کا اس قدر غلبہ ہوا کہ فاتحہ کے ختم ہونے سے پہلے ہی۔(۵۳)

ناول میں ایک جگہ پر حسین مسجد الشما تین میں پہنچتا ہے۔اس میں نماز پڑھنے کی تیاری شرر نے یوں بیان کیا ہے:

> آدھی رات سے زیادہ نہ گزری ہوگی کہ آنکھ کھل گئی اور صبح تک نماز فجر کے انتظار میں کروٹیں بدلتا رہا۔صبح کی اذان سے پہلے ہی وضو کر کے تیار ہو گیا اور دروازے پر بیٹھ کر ہر آنے والے کی صورت کا مطالعہ کرنے لگا۔(۵۴)

امام اور حسین کی بحث بھی دکھائی گئی ہے جس میں شیخ حسین کے لیے دعائیہ کلمے کہتا ہے کیونکہ اس کی سوچ اسلامی تھی اور وہ اسلام کو دوبارہ بلند کرنا چاہتا تھا وہ اپنی تمام عمر کو حصولِ علم کی خاطر وقف کرنا چاہتا ہے۔اس بحث کو شرر نے یوں لکھا ہے:

> اور چاہتا ہوں کہ یہ باقی ماندہ زندگی تحصیل علم ہی میں صرف کر دوں۔امام اگر ایسا ہے تو خدا تمھارے ارادے میں برکت دے اور تمھیں توفیق ہو کہ میرے بعد اس درس گاہ کے مالک ہو۔(۵۵)

حسین اور امام کے درمیان میں مکالمہ ہوتا ہے اور امام جسم خاکی کی اہمیت کو یعنی اللہ کی ذات کے بارے میں لکھتا ہے:

> یہی میرا جسم ہے جو کبھی وادی ایمن طور پر چمکا تھا۔یہی وہ نور ہے جو مسیح کے جسم سے خدا کی شان دکھا رہا تھا اور مُردوں میں زندگی کا چراغ روشن کر دیتا تھا۔یہی وہ نور ہے جو اشراق مجرد کی شان سے رسول آخر الزمان کے سینے میں چمکا اور یہی وہ نور ہے جو امامت کی مشعل روشن کر کے معصوموں کے جسدوں کو بدلتا رہا۔(۵۶)

حسین اور زمرد دونوں کرداروں کی بحث ایک ایسے اسلامی حکم پر بھی ہوتی ہے جس کی ممانعت اللہ نے خود فرمائی ہے یعنی حرام موت مرنا اور اس کے بارے میں شرر یوں رقم طراز ہیں:

> زمرد: کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا خودکشی کر لی تو جنت تم پر حرام ہو جائے گی، پھر تو قیامت تک ملنے کی اُمید نہیں۔(۵۷)

بلغان خاتون اور حسین کے درمیان جنت کے بارے میں یوں بحث ہوتی ہے:

> حسین: اللہ جل شانہٗ نے قرآن پاک میں وعدہ کیا ہے کہ میں انھی الفاظ سے لوگوں کا خیر مقدم کیا جائے گا جس کا مطلب یہ ہے کہ تم پر سلام ہو، پاک ہو گئے تم لوگ لہٰذا ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل ہو۔(۵۸)

ناول کے آخری صفحے پر زمرد اور حسین مکہ معظمہ میں پہنچ کر غلاف کعبہ پکڑ کر نہایت ہی رقت طلب اور جوش دل سے مغفرت کی دُعا مانگتے ہیں:

> الٰہی ہمیں تمام گناہوں سے نجات دے اگر چہ ہم نے تیری نافرمانیاں کیں تیرے مقبول و بے گناہ بندوں کی جانیں لیں.....ہم نے گناہ کیے مگر تو اب سمجھ لے کہ ہمارے قدم کو لغزشیں ہوتی تو عالم الغیب ہے، دلوں کی باتیں جانتا ہے۔(۵۹)

مرزا محمد ہادی رسوا کا سب سے مشہور ناول ''امراؤ جان ادا'' ہے۔یہ ناول ۱۹۹۹ء میں سنگ میل لاہور نے شائع کیا ہے لیکن اس سے پہلے ۱۸۹۹ء میں ورما برادرس نے شائع کیا۔یہ ناول ایک طوائف کی آپ بیتی ہے۔یہ طوائف لکھنو کی رہنے والی تھی۔مرزا رسوا سے اس طوائف کی جان پہچان تھی اس لیے انھوں نے اس کا حال اس کی زبانی سن کر بے کم و کاست شائع کروا دیا۔ناول میں امراؤ جان ادا ایک خاص کردار ہے تمام قصہ اسی کی زبانی اس کے نقطۂ نظر سے بیان ہے۔وہ بڑے اطمینان اور تسلسل کے ساتھ اپنی زندگی کے گوناں گوں تجربے بیان کرتی ہے۔جائے ولادت، ماں باپ اور بھائی کا حال، دلاور خان کا اغوا کرنا، لکھنو میں آ کر خانم کے ہاتھ بکنا، وہیں بچپن کی حدود پار کر کے عہد شباب میں داخل ہوا اور طوائف کی اصل زندگی کا آغاز کرنا، اس طرح طوائف کی ساری زندگی کا ذکر ملتا ہے۔

مرزا رسوا نے ساتھ ساتھ لکھنو کی معاشرت کی جو عکاسی کی ہے وہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔انھوں نے اس ناول اگر چہ

طوائف کی زندگی پر مبنی ہے لیکن کہیں کہیں لکھنؤ کی مذہبی زندگی کا عکس بھی ملتا ہے۔ چاہے وہ محرم کے حوالے سے ہے یا کوئی اور اسلامی تہوار تھا ضرور انھوں نے اسلامی اقدار اور روایات کی پاسداری کی ہے جن کی مثالیں ذیل کی جاتی ہے۔

ناول کے شروع ہی میں انھوں نے نماز کے بارے میں اشارہ کیا ہے اور ساتھ اس روایت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ دستر خوان کی اہمیت کیا ہے یعنی مسلمان گھروں میں سب لوگ ایک دستر خوان پر اکٹھے کھانا کھائیں، لکھتے ہیں:

> دستر خوان بچھا اماں نے کھانا نکالا، سب نے سر جوڑ کر کھانا کھایا۔ خدا کا شکر کیا ابا نے عشاء کی نماز پڑھی، سو رہے صبح کو تڑکے ابا اُٹھے، نماز پڑھی اسی وقت میں کھڑک سے اُٹھ بیٹھی...... ابا صبح کی نماز پڑھ کے وظیفہ پڑھتے ہوئے کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے......(۶۰)

حسینی اور خانم کے درمیان لڑکیوں کے حوالے سے گفتگو ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ وہ اس بات کا بھی اقرار کرتی ہیں کہ قیامت کے دن ان لڑکیوں کا جو حال ہوگا، وہ اللہ ہی جانتا ہے:

> صورت تو بھولی بھالی ہے خدا جانے کس کی لڑکی ہے۔ ہائے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا۔ خدا جانے کہاں سے موئے پکڑ لاتے ہیں۔ ذرا بھی خوف خدا نہیں۔ بوا حسینی ہم لوگ بالکل بے قصور ہیں۔ عذاب ثواب انہی موؤں کی گردن پر ہوتا ہے ہم سے کیا......
>
> حسینی دنیا میں جو چاہیں کر لیں قیامت کے دن ایسی بیویوں کا منہ کالا ہوگا۔
>
> خانم: منہ کالا ہوگا جہنم کے کندے پڑیں گے۔
>
> حسینی: خوب ہوگا موؤں کی یہی سزا ہے۔(۶۱)

محرم کے حوالے سے خانم کے گھر کا نقشہ رسوا یوں کھینچتے ہیں:

> خانم کی تعزیہ داری تمام شہر کی رنڈیوں سے بڑھ چڑھ کے تھی۔ امام باڑہ میں شیعہ کے آلات جو تھے نادر تھی۔ عشرہ محرم میں دس روز تک مجلس ہوتی تھی۔ عاشورہ کے دن سینکڑوں محتاج مومنین کی فاقہ کشی کی جاتی تھی۔ چہلم تک ہر جمعرات کو مجلس ہوتی تھی۔(۶۲)

مولوی اور خانم کے درمیان رسوا نے یوں مکالمہ لکھا ہے:

> میں: میں آپ کو سبق دوں گی
>
> مولوی: لاحول ولاقوۃ
>
> میں: لاحول ولاقوۃ یہ آپ ہر دفعہ لاحول کیوں پڑھتے ہیں۔ یہ کیا شیطان آپ کے پیچھے پھرتا ہے۔
>
> مولوی: شیطان آدمی کا دشمن ہے اس سے ہر وقت ڈرنا چاہیے۔
>
> میں: خدا سے ڈرنا چاہیے موئے شیطان سے کیا ڈرنا اور یہ کیا آپ نے کہا آدمی ہیں۔(۶۳)

ناول میں ایک جگہ پر رسوا اور امراؤ کے درمیان کربلا کی زیارت کے حوالے سے یوں بات ہوتی ہے:

> رسوا: اس میں کیا شک وہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں اب بھی سو سے اچھی ہزار سے اچھی واللہ یہ تمھاری نیت کا ثمرہ ہے خدا نے زیارت سے مشرف کیا۔
>
> امراؤ: جی ہاں مولا نے سب مرادیں پوری کیں۔ اب یہ تمنا ہے کہ مجھے کربلا، پھر بلا بھیجیں۔ میری مٹی عزیز ہو جائے۔ مرزا صاحب میں اس ارادے سے گئی تھی کہ پھر کے نہ آؤں گی مگر خدا جانے کیا ہوا تھا کہ لکھنؤ سر پر سوار ہو گیا مگر اب کی اگر خدا نے چاہا اور جانا ہو گیا تو پھر نہ آؤں گی۔(۶۴)

کائنات میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر رسوا نے یوں کیا ہے:

ارض و سماوی حادثے جن کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے مگر جب واقع ہوتے ہیں تو دلوں میں ایک خاص قسم کی دہشت سما جاتی ہے مثلاً زور سے بادل کا گرجنا، بجلی کا چمکنا، آندھیوں کا آنا، اولوں کا گرنا، یا زلزلے کا آنا، سورج گرہن یا چاند گہن وغیرہ ایسے امور اکثر خدائی غضب کی علامتیں سمجھی جاتی ہیں..... مذہبی احکام مجھ کو مفصل نہ پہنچے تھے۔(۶۵)

برصغیر مسلم تہذیب و ثقافت کا ایک واضح تصور رکھتا تھا۔ وہ اس کے تشخص کے بارے میں کسی اُلجھاوے کا شکار نہیں تھا۔ اس ثقافت کی تشکیل میں مذہب ایک بنیادی عنصر کے طور پر داخل رہا ہے۔ ۱۸۵۷ تک برصغیر کے مسلمان جس ثقافتی اور تہذیبی منطقے میں سانس لے رہے تھے وہ اپنے باطن میں ایک روحانی اور مذہبی نیوکلیس رکھتا تھا اور ثقافت کے تمام مظاہر مع شعر و ادب اس بنیادی نیوکلیس کے ساتھ بڑی شدت سے وابستہ تھے۔ سرسید تحریک میں شامل لوگوں نے مختلف اصناف کی طرف توجہ دی چنانچہ مولوی نذیر احمد نے ناول کی صنف کو چنا لیکن دیکھا جائے تو ان کا پہلا ناول "مراۃ العروس" اس تحریک سے وابستہ ہونے سے بھی کہیں پہلے لکھا جا چکا تھا مولوی نذیر احمد نے صحیح معنوں میں ایک مبلغ دین کا کام کیا ہے۔ ان کے ہم عصر ناول نگاروں یعنی سرشار، رسوا اور شرر وغیرہ کے ہاں بھی اسلامی افکار، اقدار یا روایات اور رسم و رواج کی عکاسی بھی ملتی ہے لیکن فکر کو آگے منتقل کرنے میں جو کام نذیر احمد نے کیا، وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ قیام پاکستان کے بعد آنے والی نسل نے کھل کر تو نہیں لیکن بحیثیت مسلمان انھوں نے اپنی اپنی تحریروں میں ضرور ان اسلامی احکام، اقدار، روایات اور رسم و رواج کی عکاسی کی ہے۔

اسلامی رجحانات کے تحت جو ناول لکھے گئے ان ناول نگاروں میں اہم نام مولانا شرر کا ہے۔ اسلامی رجحانات پر مبنی کتب سے ناول ایسے ہیں جن کا ایک بڑا حوالہ تاریخ کا ہے اور اس کی وجہ بھی صاف ظاہر ہے۔ اسلام جس وقت عروج پر تھا آج کے مسلمان کو اسی دور پر فخر ہے اور وہ اسی دور کی مثال دے گا۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ اردو ناول کا آغاز غدر کے بعد ہوا۔ یہ وہ دور تھا۔ جب اسلام دنیا کے مختلف خطوں میں مشکلات سے دوچار تھا اور جس کا واضح سبب یہی تھا کہ مسلمانوں نے اسلام کے اصولوں سے روگردانی شروع کی تھی جس کے نتیجے میں انہیں زوال کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔ ایسے میں جن لوگوں نے بھی اسلامی طرز فکر اور طرز زندگی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا انہوں نے تاریخ ہی سے کوئی دور چنا اور ناول تخلیق کیے۔ شرر بھی انہیں فن کاروں میں شامل تھے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کے الفاظ میں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا کو تاریخ اسلام میں بڑی دلچسپی تھی اور مذہبیات میں کافی دخل تھا اس لیے وہ مسلمانوں کے گزشتہ کارناموں کو یاد دلا کر موجودہ زوال کے اسباب پر غور کرنے کی دعوت دیتے رہے۔ یہ کام انہوں نے ناول سے کیا۔(۶۶)

خود شرر نے اپنی ناول نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی وجوہات بیان کی ہیں۔ ان کا پہلا تاریخی ناول ۱۸۸۸ء میں ادبی پرچے دلگداز میں قسط وار شائع ہوا۔ اس سلسلے میں انہوں نے لکھا۔

غالباً اردو میں یہ اپنی طرز کا پہلا ناول ہے۔ ہمارے مسلمان دوستوں نے اس ناول کو حد سے زیادہ پسند کیا۔ اس ناول نے قوم اسلام کے وہ کارنامے دکھائے جو بجھے ہوئے جوشوں اور پژمردہ حوصلوں کو از سر نو زندہ کر سکتے ہیں۔ ہمارے قدر افزا اور دلگداز کے قدر دان گواہ ہیں کہ اس کا ہر جملہ رگ حمیت اسلامی کو جوش میں لاتا تھا اور یقین ہے کہ وہ حضرات جنہوں نے غور سے اور شوق سے اس ناول کو اول سے آخر تک ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ ان کے دلوں میں قومی خون جوش مار رہا ہوگا اور وہ ترقی پر تلے بیٹھے ہوں گے۔

مجھے یہ بتا دینے کی ضرورت ہے کہ انگریزی میں ترقی کے سلسلے میں میں نے والٹر سکاٹ کا ناول طلسمان پڑھا جو تیسری صلیبی لڑائی کے پیش نظر لکھ کر تصنیف کیا گیا تھا اور اس میں مسلمانوں کی اہانت دیکھ کر مجھے ایسا جوش آیا

> کہ اسی عنوان پر ایک ناول بھی لکھوں ۔چنانچہ یہی جوش نکالنے کے لیے میں نے ناول ملک العزیز ورجینا شائع کرنا شروع کر دیا۔ جو دلگداز کا پہلا ناول ہے اس میں شاعرانہ خیال آفرینی اور زبان کی سادگی کے ساتھ تیسری صلیبی معرکہ آرائی اور اس کے نامور سلطان صلاح الدین ایوبی اور رچرڈ شیر دل کے کارنامے جو عربی تاریخوں سے مدد لے کر دکھائے گئے تھے تو مسلمانوں کے جوش قدردانی کی انتہا نہ رہی۔(۶۷)

ان اقتباسات سے یہ بھی بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے اکثر و بیشتر وہ ناول جن میں اسلام کا حوالہ موجود ہے وہ دراصل مسلمانوں ہی کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے لکھے گئے اور ساتھ ہی ان کے سامنے ماضی کے نمونے بھی رکھے گئے تاکہ اس سے ان کو تحریک ملے۔

شرر پر اردو ناول کے ناقدین میں ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ بھی شامل ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے طویل مقالے''اردو میں تاریخی ناول نگاری'' میں شرر اور ان کے ناولوں پر روشنی ڈالی ہے۔شرر کے مختلف ناولوں پر ان کے مباحث پڑھنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شرر ارادی یا غیر ارادی طور پر مسلمان قوم کے جانب دار ہیں وہ تاریخی واقعات میں بھی اسی نکتۂ نظر کے تحت اپنی مرضی کا کوئی نہ کوئی قصہ سمو دیتے ہیں اور اسے ہمارے سامنے مثال بنا کر پیش کرتے ہیں ۔ڈاکٹر رشید احمد کا اقتباس ایک ملاحظہ ہو۔

> اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اسلامی فوج کے کسی غیر معروف سپاہی یا سالار کو کسی غیر مسلم دوشیزہ کے عشق میں مبتلا دکھاتے ہیں یا غیر مسلم دوشیزہ کو مسلمان سپاہی کے عشق میں مبتلا دکھاتے ہیں اور بالآخر وہ غیر مسلم دوشیزہ اسلام قبول کر لیتی ہے۔ جیسے ملک العزیز ورجینا میں ورجینا مسلمان ہو جاتی ہے۔غالباً اس قسم کے واقعات بھی غیر مسلموں کا مسلمان ہو جانا ،خاص طور پر عیسائی عورتوں کا تبدیلی مذہب ایسے امور میں جن سے شرر ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں جنگیں بھی ہوئیں ۔ ان جنگوں کے نتائج جو بھی ہوں ۔مسلمانوں نے حسین عورتوں کی زلفوں کا گرہ گیر ہونے کے باوجود کبھی اپنا مذہب ترک نہیں کیا۔ اسی لیے مسلمانان ہند کو بھی پادریوں کے دام ہمرنگ زمین سے بچ کر رہنا چاہیے اور بڑے لالچ یا تقریر کے خوف کو خاطر میں نہیں لانا چاہیے۔(۶۸)

گو کہ گوریجہ کو شرر کے ہاں اسلامی حوالے سے جانب داری نظر آتی ہے اور وہ انہیں ایک بڑا تاریخی ناول نگار تسلیم کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کا دفاع بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً جب شرر کے ہاں اسی اسلامی رجحان کے تصور کو احسن فاروقی تعصب سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> مولانا کی کردار نگاری میں یکسانیت تکلیف دہ ہے۔شجاعت اور بہادری کے کارنامے ہر جگہ انتہائی غلو کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔جن میں عقیدت اور مذہبی تعصب نمایاں ہے۔ایسی مافوق البشر فتوحات جو ملک العزیز ورجینا، حسن انجلینا، فلپانا اور فتح اندلس وغیرہ میں ان کے ہیروؤں سے منسوب کی گئی ہیں وہ طلسمی داستانوں کے لیے مناسب سمجھی جا سکتی تھیں یہ سب خامیاں اس وجہ سے پیدا ہوئیں کہ مولانا عیسائی ناولوں کے جواب میں اسلام کی عظمت کو زندہ کرنا چاہتے تھے۔ اس پر بسیار نویسی الگ ستم تھی جو ان کو اپنی تحریروں پر نظر ثانی کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔(۶۹)

تو گوریجہ اس بات سے اتفاق نہیں کرتے بلکہ وہ احسن فاروقی کو مغرب زدہ نقاد قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

> یہ عجیب منطق ہے اگر احسن فاروقی کے ممدوح والٹر سکاٹ مذہبی تعصب دکھائیں اور اپنے کرداروں کی بہادری میں مبالغہ دکھائیں تو جائز...... اور اگر عبدالحلیم شرر ایسا کریں تو قابل گردن زدنی......اس کی وجہ غالباً

یہ ہے کہ احسن فاروقی مغربی فن پاروں کے نقطہ نظر سے مشرقی فن پاروں کو یورپی تنقیدی اصولوں کے تحت جانچتے ہیں اس لیے انھیں اردو ناول نگاروں میں نقائص کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔(۷۰)

مذہب کے حوالے سے لکھے گئے ناول نگاروں میں ایم اسلم اور نسیم حجازی بھی کافی مقبول ناول نگار ہیں لیکن ان ناولوں کو ہم زیادہ سے زیادہ نظریاتی ناول ہی کہہ سکتے ہیں۔ان ناولوں میں اسلامی تاریخ کو ضمنی قصوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جس سے عام قاری اسلامی تاریخ اور اقدار سے معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ لطف اندوز ہوتا ہے ان ناولوں میں جو منظر نگاری کی جاتی ہے اس سے کسی حد تک اسلامی طرز زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔کس طرح سے ہمارے اسلاف نے تاریخ کے مختلف ادوار میں حکمرانی کی اور وہ کون سے جذبات تھے جنھوں نے انھیں دیگر اقوام پر حاوی کیا۔یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب ہمیں نظریاتی ناولوں میں مل جاتا ہے۔ڈاکٹر تصدق راجا نسیم حجازی کے بارے میں لکھتے ہیں:

نسیم حجازی فکر اقبال کے مبلغ، پاکستانیت کے مفکر اور عظیم ناول نگار کی حیثیت سے ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔(۷۱)

جب کہ پروفیسر مرزا منور، نسیم حجازی کے فن کے بارے میں لکھتے ہیں۔

نسیم حجازی نے ماضی کے تاریک دور بھی سامنے لا رکھے، مسلمانوں کی شکستوں کی کہانیاں بھی سنائیں لیکن ان کہانیوں کے سنانے سے بھی مقصد تعمیری تھا مایوسی پھیلانا ہرگز مقصود نہ تھا اور نسیم حجازی کے کسی بھی ناول کو پڑھ کر قاری کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوا۔(۷۲)

ان کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی بھی کچھ اس قسم کی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

انہوں نے اسلام کی عظمت رفتہ کو اپنے قلمی جہاد سے معاشرے کے عام انسان کے شعور کا حصہ ایسی سحر انگیزی کے ساتھ بنایا ہے کہ مولانا عبدالحلیم شرر کے بعد کوئی دوسرا اس سطح پر نظر نہیں آتا۔(۷۳)

اسی طرح کی دیگر کئی آرا ہمارے مختلف ناقدین نے دی ہیں تاہم ڈاکٹر ممتاز احمد نے بے لاگ تنقید کا ثبوت دیا ہے لکھتے ہیں:

بہت سے پڑھنے والوں کے نزدیک یہ رائے شاید پسندیدہ نہ ہو لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ زندگی کی جو بصیرت دوسرے قسم کے سنجیدہ ناولوں میں پائی جاتی ہے اور جو دوسرے مذاہب کے ماننے والوں اور سیکولر نظریات رکھنے والوں کو بھی اپیل کرتی ہے۔وہ اتفاق سے ہمارے تاریخی/اسلامی ناولوں میں اس شدت کے ساتھ نہیں آتی یہ علیحدہ بات ہے کہ مذہب اسلام سے تعلق رکھنے والے اور نظریاتی ادب سے محبت رکھنے والے قارئین اور نقاد کے لیے نسیم حجازی جیسے پختہ کار فن کار کے ناولوں میں بہت کشش charm ہے۔(۷۴)

کم و بیش یہی رائے دیگر اسلامی رجحان رکھنے والے ناول نگاروں کے ناولوں پر بھی صادق آتی ہے۔جنھوں نے متعصبانہ طرز پر ناول لکھے اور جن کا مقصد محض مذہب کا پرچار تھا لیکن اس قبیل کے ناولوں کو ہمارے نقادوں نے کچھ زیادہ نہیں سراہا۔اول تو اس لیے کہ اس طرح کے نظریاتی ناول کبھی بھی آفاقی بلندیوں کو نہیں چھو سکتے۔کیونکہ نظریات کا ٹکراؤ بہر حال معاشروں میں موجود ہوتا ہے۔یہاں یہ سوال ہمارے ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا مذہبی اقدار ادبی اقدار کے مقابلے میں کمتر ہیں۔یا پھر یہ سوال، کہ کیا وجہ ہے کہ جس تحریر میں مذہبی عناصر شامل ہوں اسے ہم اعلیٰ ادبی شہ پارہ تسلیم نہیں کر پاتے۔اس کا جواب یہ ہے کہ ادب دراصل آفاقی اقدار کا نام ہے۔جہاں تک مذہبی اقدار کا تعلق ہے تو وہ ایک معاشرے سے دوسرے معاشرے میں تبدیل ہوتی رہتی ہیں کوئی بھی ایسا ناول جس میں کسی خاص مذہبی رجحان کی عکاسی کی گئی ہو۔اگر اسے پڑھنے والا اسی مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور اگر یہ تعلق شدت پر بھی مبنی ہو تو اسے بلاشبہ وہ ناول دنیا کا سب سے بہتر ناول دکھائی دے گا اور دنیا کے بہترین ناول بھی اس کے مقابلے میں اسے ہیچ نظر آئیں گے۔اس کے برعکس اگر کسی ناول میں آفاقی نظریات کی بات کی گئی ہے تو ناول یا وہ

ادب پھر زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو جاتا ہے یہی بات ہمارے ادب میں بھی نظریاتی ناولوں کا انتقاد کرتے ہوئے ہمارے نقاد ان کو وہ مقام دینے سے قاصر نظر آتے ہیں جو وہ مرزا رسوا، قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین یا پھر احسن فاروقی جیسے ناول نگاروں کو دیتے ہیں اس معاملے میں یہ بات قابل غور ہے کہ کیا مذہبی رجحان پر مشتمل ناول ارادی طور پر لکھے جاتے ہیں یا غیر ارادی طور پر۔ بیشتر ناقدین نے ایسے ناولوں کو ارادی پروپیگنڈہ سے تعبیر کیا ہے جس کی وجہ سے ان ناولوں کے فنی اور فکری محاسن پر متعبر نقادوں کی جانب سے خاطر خواہ تنقید نہیں ہوئی اس کی دو وجوہات ہیں اول یہ بات فرض کر لی جاتی ہے کہ بطور نظریاتی ناول ان مصنفین کے ناول اعلیٰ ادب کے زمرے میں نہیں آتے اور ثانیاً ان ناولوں کی تنقید کچھ ایسے سوالات اٹھاتی ہے جن کا جواب فلسفے اور مابعد الطبیعات ہی میں مل سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اگر ناول نگار کا Motive اس کے فکری نظام سے میل کھاتا ہے اور اس میں عالمانہ بدنیتی شامل نہیں تو پھر ایسے ناول کو نظریاتی ناول کیوں کہا جائے؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی ادبی فن پارہ اپنے خالق کے فکری و تشائی نظام سے الگ نہیں ہو پاتا بلکہ مثبت یا منفی طور پر اپنے خالق کے کسی نفسیاتی یا فکری رجحان کی عکاسی کرتا ہے اس لحاظ سے تمام ادب نظریاتی ادب بن جاتا ہے۔ نظریہ چاہے انفرادی ہوں جیسے قرۃ العین حیدر کا ''تاریخی دوام'' یا نسیم حجازی کی اسلامی تاریخ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ آیا ناول نگار نے اپنی ذات کا اظہار کیا ہے یا کسی معاشرتی نظریے کا پرچار۔ نظریاتی ناولوں میں یہ پہلو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اسی طرح مذہبی اقدار اور عالمگیر آفاقی سچائیوں میں تناقص نہیں پایا جاتا یا کم از کم مذہب کی مثالی توضیح سے نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ اگر ایک ادب کی بنیاد آفاقی اور عالمگیر اقدار پر رکھی گئی ہیں تو کیوں وہ دوام نہیں پاتا۔ اس سوال کو نظریاتی ناولوں کے تناظر میں نظر انداز کرنے کی وجہ ناقدین کی نصابی تنقید ہے جس میں ایسے سوالوں کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے جو براہ راست تنقید طلب نہیں ہوتے ایک نیا زاویہ تنقید یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اگر جان ملٹن کی Paradise lost، لیو ٹالسٹائی کے ناول War and Peace اور ہرمن ہیس کا ناول ''سدھارتھ'' ایک خاص مذہبی نقطہ نظر کے پرچار کے باوجود عظیم ادب کا شاہکار ہیں تو ''شاہین'' یا ''آخری چٹان'' جیسے ناولوں کو وہ مقام نہ ملنے کی وجہ کیا ہے۔ اس جواب کی تلاش یقیناً فنی محاسن کے تجزیے سے بڑھ کر مابعد الطبیعاتی اور Ethiclal خطوط پر سوچنے کی متقاضی ہوتی ہے اردو ادب میں تا حال یہ رجحان مفقود ہے۔

اردو میں ایسے ناول بھی موجود ہیں جن میں ہمیں اسلام کے وہ آفاقی تصورات بھی مل جاتے ہیں جنہیں بجا طور پر ادبی و آفاقی کہا جاتا ہے۔ افسوس کہ ایسے ناول خال خال ہی سامنے آئے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کو سامنے رکھتے ہوئے ایک خوش آئند مستقبل کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ''راجہ گدھ'' بھی ایسا ہی ناول ہے جس میں مصنفہ ''بانو قدسیہ'' نے مذہب کے ایسے گوشوں پر بات کی ہے جن میں عالمگیریت پائی جاتی ہے۔ ایک طرف یہ ناول نفسیاتی حوالے سے اہم ہے۔ وہاں ہمیں ایک بڑا حوالہ اسلامی رجحان کا بھی ملتا ہے اس میں انہوں نے تین بڑے رجحانات کے ذریعے اسلامی عقائد کی توضیح و تشریح کی ہے ایک بڑا رجحان حلال و حرام کا ہے۔ اس مذہبی رجحان کو ہم آفاقی اس طور سے کہہ سکتے ہیں کہ مذاہب عالم میں بھی حق اور ناحق کا تصور موجود ہے۔ وہ چیز جو آپ کی نہیں ہے وہ بہر صورت آپ کی نہیں ہے اور جو چیز آپ کی ہے وہ آپ کی ہے۔ یہ وہ تصور ہے جس کا ہر معاشرے میں احترام کیا جاتا ہے۔ بانو قدسیہ نے اس تصور کو اسلامی عقائد کے حوالے سے پیش کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں آدم اور شیطان کے قصے کو بھی بہت خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ضمنی پلاٹ میں انہوں نے جانوروں اور پرندوں کی محفل سجائی ہے۔ اس میں بھی انہوں نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ وہ روشنی جو چودہ سو سال پہلے دنیا میں آئی اور جس نے انسانیت کے فطری قوانین کی از سر نو تشکیل کی، اس سے انسان کی مجموعی زندگی پر کیا اثر پڑا۔ ''راجہ گدھ'' بلاشبہ ایک تہذیبی علامت ہے ایک ایسے انسان کی جس کی سرشت میں بدی اور شر کا عنصر اس طور سے داخل ہو چکا ہے کہ اور اس حد تک اس کی رگوں میں شر کا زہر سرایت کر چکا ہے کہ وہ اب کسی طرح سے پلٹ کر واپس نہیں آ سکتا۔

بنیادی طور پر ہم اسے ایک گمراہ انسان کا المیہ بھی قرار دے سکتے ہیں ۔ایک ایسا بد نصیب انسان جس کو موقع بھی ملا لیکن وہ اس سے استفادہ نہ کر سکا اور یہی چیز اس ناول کے مرکزی کردار میں ہمیں نظر آتی ہے قیوم بھی ایک ایسا ہی شخص ہے جس کو زندگی کے اس سفر میں درست راستہ نظر نہیں آتا ۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

> پروفیسر سہیل کا نقطہ نظر بڑا اہم ہے۔مثلاً یہ کہ انسان پہلے یا تو خود اپنی تلاش کرتا تھا یا اپنے خدا کی ۔لیکن صورت حال یہ ہے کہ آج نہ تو وہ اپنی تلاش کرپاتا ہے اور نہ خدا کی ۔کیونکہ وہ جس قسم کی دیوانگی اور عشق لاحاصل کے آزار میں مبتلا ہے۔انہوں نے اسے بے سمتی ، اخلاقی پستی اور گناہ کی شاہراہ پر دھکیل دیا ہے جہاں اس کی مراجعت ضروری ہے۔(۷۵)

اس کے علاوہ ایک دوسرا بڑا مذہبی تاثر عرفان کا بھی ہے ناول میں دو ہی ایسے کردار ہیں جن کو حقیقی عرفان نصیب ہوا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر''اردو ناول نگاری'' مکتبہ میری لائبریری لاہور، ۱۹۶۹ء، ص۴۹
۲۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر''اردو ناول کی تنقیدی تاریخ'' اردو اکیڈمی لاہور ۱۹۶۹ء، ص۳۳۔۳۴
۳۔ ایضاً، ص۶۷
۴۔ نذیر احمد''ابن الوقت'' مقبول اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۶ء، ص۹
۵۔ ایضاً ص۴۷
۶۔ ایضاً ص۴۸
۷۔ ایضاً ص۵۵
۸۔ ایضاً ص۵۵
۹۔ ایضاً ص۵۶
۱۰۔ ایضاً ص۷۲
۱۱۔ ایضاً ص۷۶
۱۲۔ ایضاً ص۹۰
۱۳۔ ایضاً ص۹۴
۱۴۔ ایضاً ص۱۱۳
۱۵۔ ایضاً ص۱۲۹
۱۶۔ ایضاً ص۱۳۷
۱۷۔ ایضاً ص۱۴۲
۱۸۔ ایضاً ص۱۶۹
۱۹۔ ایضاً ص۱۸۴

۲۰۔ نذیر احمد ''فسانۂ مبتلا'' مکینکل پبلشرز لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۰

۲۱۔ ایضاً ص ۳۱

۲۲۔ ایضاً ص ۳۲

۲۳۔ ایضاً ص ۳۵

۲۴۔ ایضاً ص ۳۸

۲۵۔ ایضاً ص ۴۷

۲۶۔ ایضاً ص ۵۰

۲۷۔ ایضاً ص ۵۵

۲۸۔ ایضاً ص ۵۹

۲۹۔ ایضاً ص ۶۷

۳۰۔ ایضاً ص ۷۳

۳۱۔ ایضاً ص ۷۸

۳۲۔ ایضاً ص ۱۰۹

۳۳۔ ایضاً ص ۱۱

۳۴۔ ایضاً ص ۱۱۳

۳۵۔ ایضاً ص ۱۷۹

۳۶۔ ایضاً ص ۱۸۱

۳۷۔ ایضاً ص ۱۸۲

۳۸۔ نذیر احمد ''بنات النعش'' الفیصل پبلشرز، لاہور، بار اوّل، اپریل، ۱۹۹۵ء، ص ۶

۳۹۔ ایضاً ص ۴۰

۴۰۔ ایضاً ص ۴۲

۴۱۔ ایضاً ص ۴۷

۴۲۔ ایضاً ص ۸۰

۴۳۔ ایضاً ص ۱۳۶

۴۴۔ ایضاً ص ۱۳۶

۴۵۔ اے بی اشرف، ڈاکٹر ''مسائل ادب'' تنقید و تجزیہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۳۱۶

۴۶۔ پروفیسر ممتاز حسین، ''ادب اور شعور'' فضلی سنز کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۱، ۱۰۲

۴۷۔ جمیل ملک ''ادبی منظر نامہ'' مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۲۴۲

۴۸۔ پریم چند ''میدان عمل'' مشمولہ کلیات پریم چند مرتبہ مدن گوپال، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، دہلی ستمبر ۲۰۰۱ء،
ص ۳۶

۴۹۔ ایضاً ص ۷۶

۵۰۔ ایضاً ص ۷۶

۵۱۔ پریم چند ''میدان عمل'' مشمولہ کلیات پریم چند مرتبہ مدن گوپال، ص ۹۰
۵۲۔ ایضاً ص ۳۲۵
۵۳۔ ایضاً ص ۳۳۶
۵۴۔ عبدالحلیم شرر ''فردوسِ بریں'' مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع دوم ۱۹۹۵ء، ص ۵
۵۵۔ ایضاً ص ۴۷
۵۶۔ ایضاً ص ۶۵
۵۷۔ ایضاً ص ۸۳
۵۸۔ ایضاً ص ۹۵
۵۹۔ ایضاً ص ۱۱۰
۶۰۔ ایضاً ص ۱۶۵
۶۱۔ ایضاً ص ۲۲۴
۶۲۔ مرزا ہادی رسوا ''امراؤ جان ادا'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۹ء، ص ۲۴
۶۳۔ ایضاً ص ۲۶
۶۴۔ ایضاً ص ۷۷
۶۵۔ ایضاً ص ۱۲۵
۶۶۔ ایضاً ص ۱۶۹
۶۷۔ ایضاً ص ۱۹۵
۶۸۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر ''اردو ناول نگاری'' ص ۶۷
۶۹۔ مضامین شرر عبدالحلیم شرر، ص ۲۵۱ جلد ۳، دلگداز مئی ۱۹۳۴ء، ص ۹۷۔۹۸
۷۰۔ رشید احمد گوریجہ، ڈاکٹر ''اردو میں تاریخی ناول'' ابلاغ لاہور ۱۹۹۴ء، ص ۱۹۲
۷۱۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر ''ناول کیا ہے؟'' کراچی یونیورسٹی ۱۹۸۶ء، ص ۱۷۸
۷۲۔ ایضاً، ص ۱۷۸
۷۳۔ پروفیسر منور مرزا ''نسیم حجازی ایک مطالعہ'' سیارہ لاہور اشاعت خاص، ۲۷ سالنامہ ۱۹۸۹ء، ص ۲۰۲
۷۴۔ ایضاً، ص ۱۹۸
۷۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر ''نسیم حجازی ایک مطالعہ'' ص ۱۹۸
۷۶۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر ''آزادی کے بعد اردو ناول'' انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۹۷ء، ص ۱۵۷
۷۷۔ ایضاً، ص ۱۶